فقہ حنفی کی امتیازی خصوصیات

تحریر: حافظ شبیر احمد، استاذ شعبہ علوم اسلامیہ و ممبر دار الافتاء، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

نبی کریم ﷺ کے بعد خلفائے راشدین کی حکومت اسلام کے اصولِ حکمرانی پر قائم ہوئی تھی۔ آنحضرت ﷺ کی براہِ راست تعلیم و تربیت اور عملی رہنمائی سے جو معاشرہ وجود میں آیا تھا اس کا ہر فرد یہ جانتا تھا کہ اسلام کے احکام اور اس کی روح کے مطابق کس قسم کا نظام حکومت بننا چاہیے۔ اگرچہ آنحضرت ﷺ نے اپنی جانشینی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا، لیکن مسلم معاشرے کے لوگوں نے خود یہ جان لیا کہ اسلام ایک شوروی خلافت کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لئے وہاں نہ کسی خاندانی بادشاہی کی بنیاد ڈالی گئی، نہ کوئی شخص طاقت استعمال کر کے برسرِ اقتدار آیا، نہ کسی نے خلافت حاصل کرنے کیلئے خود کوئی دوڑ دھوپ یا برائے نام بھی اس کیلئے کوشش کی، بلکہ یکے بعد دیگرے چار اصحاب کو لوگ اپنی آزاد مرضی سے خلیفہ بناتے چلے گئے۔ اس خلافت کو امت نے خلافتِ راشدہ (راست رو خلافت) قرار دیا ہے۔ اس سے خود بخود یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں خلافت کا صحیح طرز یہی ہے۔

خلافت راشدہ کی اصل خوبی یہ تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی مکمل نیابت تھی۔ خلیفہ راشد محض راشد (راست رو) ہی نہ ہوتا تھا بلکہ مرشد (راہ نما) بھی ہوتا تھا اس کا کام محض مملکت کا نظم و نسق چلانا اور فوجیں لڑانا نہ تھا بلکہ اللہ کے پورے دین کو مجموعی طور پر قائم کرنا تھا۔ اس کی ذات میں ایک ہی مرکزی قیادت تھی جو سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کی سربراہی بھی کرتی تھی اور عقیدہ و مذہب، اخلاق و روحانیت، قانون و شریعت، تہذیب و تمدن، تعلیم و تربیت اور دعوت و تبلیغ کے تمام معاملات میں ان کی امامت و راہبری کے فرائض بھی انجام دیتی تھی۔ جس طرح اسلام ہر پہلو میں جامع ہے اسی طرح یہ قیادت بھی ہر پہلو کی جامع تھی اور مسلمان پورے اعتماد کے ساتھ اپنی اجتماعی زندگی اس کی رہنمائی میں بسر کر رہے تھے۔

اس خلافت کی جگہ جب ملوکیت (شہنشاہیت یا ڈکٹیٹر شپ) آئی تو نہ وہ اس جامع قیادت کی اہل تھی نہ مسلمان ایک دن کیلئے بھی اس کو یہ حیثیت دینے کیلئے تیار ہوئے۔ بادشاہوں کے جو کارنامے تاریخ میں محفوظ ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا کوئی اخلاقی وقار قوم میں قائم نہ رہ سکا

تھا۔وہ گردنیں زبردستی جھکا سکتے تھے اور وہ انہوں نے جھکالیں۔وہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو خوف وطمع کے ہتھیاروں سے اپنی اغراض کا خادم بھی بنا سکتے تھے اور انہوں نے بنالیا۔ مگر وہ دل نہیں جیت سکتے تھے کہ لوگ ان کو اپنے دین کا امام بھی مان لیتے۔

یہ نئی صورتِ حال پیدا ہوتے ہی مسلمانوں کی قیادت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی :

سیاسی قیادت: ایک حصہ سیاسی قیادت کا تھا جسے طاقت سے بادشاہوں نے حاصل کر لیا تھا' اور چونکہ اسے نہ طاقت کے بغیر ہٹایا جاسکتا تھا' نہ سیاسی قیادت بلاطاقت ممکن ہی تھی' اس لئے امت نے بادل ناخواستہ اسے قبول کر لیا۔ یہ قیادت کافر نہ تھی کہ اسے رد کر دینے کے سوا چارہ نہ ہوتا۔اس کے چلانے والے مسلمان تھے جو اسلام اور اس کے قانون کو مانتے تھے۔کتاب اللہ وسنت رسول اللہ ﷺ کے حجت ہونے کا انہوں نے کبھی انکار نہ کیا تھا۔عام معاملات ان کی حکومت میں شریعت ہی کے مطابق انجام پاتے تھے۔صرف ان کی سیاست دین کی تابع نہ تھی اور اس کی خاطر وہ اسلام کے اصولِ حکمرانی سے ہٹ گئے تھے۔اس لئے امت نے ان کی سیاسی قیادت اس حد تک قبول کرلی تھی کہ ان کے تحت مملکت کا انتظام چلتا رہے۔امن وامان قائم رہے۔ سرحدوں کی حفاظت ہوتی رہے' اور عدالتوں کے ذریعے اسلامی قوانین کا اجراء برقرار رہے۔ان مقاصد کیلئے صحابہؓ' تابعین اور تبع تابعین نے اگر اس قیادت کی بیعت کی تو وہ اس معنی میں نہ تھی کہ وہ انہی بادشاہوں کو امامِ برحق اور ان کی خلافت کو خلافتِ راشدہ ومرشدہ مانتے تھے' بلکہ وہ صرف اس معنی میں تھی کہ وہ اس امر واقعی کو تسلیم کرتے تھے کہ اب امت کی سیاسی قیادت کے مالک یہی لوگ ہیں۔

دینی قیادت: دوسرا حصہ دینی قیادت کا تھا جسے بقایائے صحابہ' تابعین وتبع تابعین' فقہا ومحدثین اور صلحائے امت نے آگے بڑھ کر سنبھال لیا اور امت نے اپنے دین کے معاملہ میں پورے اطمینان کے ساتھ ان کی امامت تسلیم کرلی۔یہ قیادت اگرچہ منظم نہ تھی۔اگرچہ اس کا کوئی ایک امام نہ تھا جسے سب نے اپنا مرشد مان لیا ہو۔اگرچہ اس کی کوئی بااختیار کونسل نہ تھی کہ جو دینی مسائل پیدا ہوں ان کے بارے میں بروقت وہ ایک فیصلہ صادر کردے اور وہ پوری مملکت میں مان لیا جائے۔یہ سب لوگ اپنی انفرادی حیثیت میں الگ الگ کام کر رہے تھے اور ان متفرق افراد کے پاس اخلاقی اثر ووقار کے سوا کوئی طاقت نہ تھی۔ لیکن چونکہ یہ سب ایک ہی چشمہ ہدایت۔

کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ سے فیض یاب تھے' اور نیک نیتی کے ساتھ دینی رہنمائی کر رہے تھے' اس لئے جزئیات میں مختلف الرائے ہونے کے باوجود مجموعی طور پر ان کا مزاج ایک ہی تھا اور دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں پراگندہ ہونے کے باوجود ان کا پورا گروہ' مسلمانوں کو ایک ہی فکری و اخلاقی قیادت فراہم کر رہا تھا۔

دونوں قیادتوں کا باہمی تعلق: ان دونوں قسم کی قیادتوں میں تعاون کم اور تصادم یا کم از کم عدم تعاون زیادہ رہا۔ سیاسی قیادت نے دینی قیادت کو اس کے فرائض انجام دینے میں بہت کم مدد دی اور جتنی مدد وہ دے سکتی تھی' دینی قیادت نے اس سے بھی کم اسے قبول کیا۔ کیونکہ اس مدد کے بدلے میں جو قیمت اسے سیاسی قیادت کو ادا کرنا پڑتی اسے ادا کرنے کیلئے اس کا ایمان و ضمیر تیار نہ تھا پھر خود امت کا حال بھی یہ تھا کہ دینی قیادت کے لوگوں میں سے جو بھی سلاطین کے قریب گیا' اور جس نے بھی کوئی منصب یا وظیفہ ان سے قبول کر لیا' وہ مشکل ہی سے قوم میں اپنا اعتماد برقرار رکھ سکا۔ سلاطین سے بے نیازی اور ان کے قہر و غضب کے مقابلے میں ثابت قدمی' مسلمانوں کے اندر دینی قیادت کی اہلیت کا معیار بن گئی تھی۔ اس معیار سے ہٹ کر اگر کوئی اللہ کا بندہ چلا تو قوم بڑی کڑی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتی رہی اور اس کی بزرگی کو اس نے صرف اس وقت تسلیم کیا جب سلطان کے قریب جا کر بھی اس نے دین کے معاملہ میں کوئی مصالحت نہ کی۔ عام مسلمان تو درکنار' خود وہ لوگ بھی جو سیاسی قیادت کے ہاتھ بک چکے تھے' اس بات کو برداشت کرنے کیلئے تیار نہ تھے کہ دین کا امام و پیشوا کسی ایسے شخص کو مان لیں جو انہی کی طرح بک جانے والا ہو' یا طاقت سے دب کر احکام دین میں تحریف کرنے لگے۔

اس طرح پہلی صدی ہجری کے وسط سے ہی دینی قیادت کا راستہ سیاسی قیادت کے راستے سے الگ ہو چکا تھا۔ علماء امت نے تفسیر' حدیث' فقہ اور دوسرے علومِ دینیہ کی تدوین اور درس و افتاء کا جتنا کام کیا' حکومت سے آزاد رہ کر' اس کی مدد کے بغیر' بلکہ بارہا اس کی مزاحمت کے باوجود اور اس کی بے جا مداخلتوں کا سخت مقابلہ کرتے ہوئے کیا۔ صلحائے امت نے مسلمانوں کے ذہن اور ان کے اخلاق و کردار کی تربیت و تہذیب کیلئے جو کام کیا وہ بھی سیاسی قیادت سے پوری طرح غیر متاثر رہا۔ اور اسلام کی اشاعت بھی زیادہ تر انہی بزرگوں کی بدولت ہوئی۔ سلاطین نے زیادہ تر صرف یہ خدمت انجام دی کہ ملک فتح کر کے کروڑوں انسانوں کو اسلام کے دائرہ اثر میں لے آئے۔ اس کے بعد ان کروڑوں انسانوں کا دائرہ ایمان میں داخل ہو جانا بادشاہوں کی سیاست

کا نہیں بلکہ صالحین امت کے پاکیزہ کردار کا کرشمہ تھا۔

اسلام کا اصل منشا لیکن یہ ظاہر ہے کہ اسلام کا منشا قیادت کی اس تقسیم سے پورا نہیں ہوتا۔ سیاسی قیادت سے الگ ہو کر دینی قیادت نے اسلامی اقدار کے تحفظ کیلئے جو بیش بہا خدمات انجام دیں وہ بلا شبہ نہایت قابل قدر ہیں۔ آج یہ انہی کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں اسلام زندہ ہے اور امتِ مسلمہ اپنے دین کو اس کے صحیح خدوخال میں دیکھ رہی ہے۔ مگر اسلام کا ٹھیک ٹھیک منشا تو اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جبکہ اس امت کو ایک ایسی قیادت میسر ہو جو خلافتِ راشدہ کی طرح بیک وقت دینی قیادت بھی ہو اور سیاسی قیادت بھی، جس کا سیاسی اقتدار اپنے تمام ذرائع و وسائل نہ صرف دین کے مقاصد کی تکمیل میں صرف کرے، بلکہ اس اقتدار کا اصل مقصد دین ہی کے مقاصد کی تکمیل ہو۔ یہ صورتِ حال اگر ڈیڑھ صدی بھی باقی رہ گئی ہوتی تو شاید دنیا میں کفر باقی نہ رہتا۔ اور اگر رہ بھی جاتا تو کبھی سر اٹھانے کے قابل نہ ہوتا۔

مسلمانوں میں مذہبی اختلافات کی ابتداء اور اس کے اسباب:

خلافتِ راشدہ کا زوال جن حالات میں اور جن اسباب سے ہوا ان کے نتائج میں سے ایک اہم نتیجہ یہ بھی تھا کہ امتِ مسلمہ کے اندر مذہبی اختلافات رونما ہو گئے۔ پھر ان اختلافات کو جس چیز نے جمنے اور مستقل فرقوں کی بنیاد بننے کا موقع دے دیا وہ بھی اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ نظامِ خلافت اپنی اصلی شکل پر قائم نہ رہا تھا، کیونکہ ملوکیت کے نظام میں سرے سے کوئی ایسا بااختیار اور معتمد علیہ ادارہ موجود ہی نہ تھا جو اختلافات کے پیدا ہو جانے کی صورت میں ان کو بر وقت صحیح طریقے سے حل کر دیتا۔

ابتداء اس فتنے کی بھی بظاہر کچھ بہت زیادہ خطرناک نہ تھی۔ صرف ایک شورش تھی جو بعض سیاسی اور انتظامی شکایات کی بنا پر سیدنا عثمانؓ کے خلاف ان کے آخری دور میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی پشت پر نہ کوئی نظریہ اور فلسفہ تھا، نہ کوئی مذہبی عقیدہ۔ مگر جب اس کے نتیجے میں آنجنابؓ کی شہادت واقع ہو گئی اور حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں نزاعات کے طوفان نے ایک زبردست خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی اور جنگ جمل، جنگ صفین، قضیۂ تحکیم اور جنگ نہروان کے واقعات پے در پے پیش آتے چلے گئے، تو ذہنوں میں یہ سوالات ابھرے اور جگہ جگہ موضوع بحث بننے لگے کہ ان لڑائیوں میں حق پر کون ہے اور کیوں ہے؟ باطل پر کون ہے اور اس

کے برسرِ باطل ہونے کے کیا وجوہ ہیں؟ کسی کے نزدیک اگر فریقین باطل پر یا حق پر ہیں تو وہ کس بنا پر یہ رائے رکھتا ہے؟ اور اگر کوئی فریقین کے معاملہ میں سکوت یا غیر جانبداری اختیار کرتا ہے تو اس کے پاس اپنی اس روش کیلئے کیا دلیل ہے؟ ان سوالات کے نتیجے میں چند قطعی اور واضح نظریات پیدا ہوئے جو اپنی اصل کے لحاظ سے خالص سیاسی تھے' مگر بعد میں ہر نظریئے کے حامی گروہ کو بتدریج اپنا موقف مضبوط کرنے کیلئے کچھ نہ کچھ دینیاتی بنیادیں فراہم کرنی پڑیں اور اس طرح یہ سیاسی فرقے رفتہ رفتہ مذہبی فرقوں میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔۔۔

یہ اختلافات محض عقیدہ وخیال کے اختلافات نہ رہے بلکہ ان میں وہ شدت اور حدت پیدا ہوتی چلی گئی جس نے مسلمانوں کی وحدت ملی کو سخت خطرے میں مبتلا کر دیا۔ اختلافی بحثیں گھر گھر چل پڑیں۔ ہر بحث میں سے نئے نئے سیاسی' دینیاتی اور فلسفیانہ مسائل نکلتے رہے۔ ہر نئے مسئلے کے اٹھنے پر فرقے اور فرقوں کے اندر مزید چھوٹے چھوٹے فرقے بننے لگے اور ان فرقوں کے اندر باہمی تعصبات ہی نہیں پیدا ہوئے بلکہ جھگڑوں اور فسادات تک نوبت پہنچ گئی۔ کوفہ' عراق کا صدر مقام اس طوفان کا سب سے بڑا مرکز تھا' کیونکہ عراق ہی کے علاقے میں جمل' صفین اور نہروان کے معرکے ہوئے' یہیں حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا دل دہلا دینے والا واقعہ پیش آیا۔ یہیں بڑے بڑے فرقوں کی پیدائش ہوئی' اور اسی جگہ بنی امیہ اور پھر بنی عباس نے اپنی مخالف طاقتوں کو دبانے کیلئے سب سے زیادہ تشدد استعمال کیا۔ تفرقہ واختلاف کے اس دور میں جو کثیر التعداد فرقے پیدا ہوئے ان سب کی جڑ دراصل چار فرقے تھے' شیعہ' خوارج' مرجئہ اور معتزلہ۔

سوادِ اعظم کی حالت: ان متحارب اور متشدد گروہوں کے درمیان مسلمانوں کا سوادِ اعظم اپنے خیالات میں انہی نظریات اور اصولوں پر قائم تھا جو خلفاء راشدین کے زمانے سے مسلم چلے آرہے تھے اور جنہیں جمہور صحابہ وتابعین اور عامۃ المسلمین ابتداء سے اسلامی اصول ونظریات سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کی بمشکل ۸۔۱۰ فی صد آبادی اس تفرقے سے متاثر ہوئی تھی۔ باقی سب لوگ مسلک جمہور ہی پر قائم تھے۔ مگر دور اختلاف شروع ہونے کے بعد امام ابو حنیفہؒ کے وقت تک کسی نے ان اختلافی مسائل میں جمہور اہل اسلام کے مسلک کی باقاعدہ توضیح نہیں کی تھی جو ایک پورے نظامِ فکر کی شکل میں مرتب ہوتی۔ بلکہ مختلف فقہاء ومحدثین مختلف مواقع پر اپنے اقوال' فتاوی' روایات' یا طرز عمل سے منتشر طور پر اس کے کسی پہلو کو واضح کرتے رہتے تھے۔

امام ابو حنیفہؒ کا کارنامہ

اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ ملوکیت کا آغاز ہوتے ہی امت کی قیادت دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک سیاسی قیادت جس کی زمامِ کار ملوک و امراء اور سلاطین کے ہاتھ میں رہی۔ اور دوسری دینی قیادت جسے امت کے علماء و صلحاء نے سنبھال لیا۔ قیادت کے اس دورِ تفریق میں سیاسی قیادت کا کیا رنگ تھا' اس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ اب ہم ایک نظر یہ بھی دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ لوگ کیسے تھے جنہوں نے امت کی دینی قیادت سنبھالی' اور کس طرح انہوں نے وہ مسائل حل کیے جو اس دور میں پیدا ہوئے تھے اور صدیوں بعد پیش آنے والے مسائل کے حل کی نشاندھی بھی کی تھی۔ اس مقصد کیلئے ہم امام اعظم ابو حنیفہؒ کو دینی قیادت کے ایک نمائندے کی حیثیت سے لے کر یہاں مختصراً ان کا کارنامہ پیش کریں گے اور اس کے بعد بتائیں گے کہ ان کی سربراہی میں جو فقہ مدون ہوئی اس کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں :

مختصر حالات زندگی :

امام اعظمؒ کا اسم گرامی نعمان بن ثابت تھا۔ عراق کے دارالحکومت کوفہ میں ان کی پیدائش معتبر روایات کے مطابق ۸۰ھ (۶۹۹ء) میں ہوئی۔ عبدالملک بن مروان اس وقت اموی خلیفہ تھا اور حجاج بن یوسف عراق کا گورنر۔ انہوں نے اپنی زندگی کے ۵۲ سال بنی امیہ کے عہد حکومت میں اور ۱۸ سال بنی عباس کے عہد حکومت میں گزارے۔ حجاج بن یوسف کی موت کے وقت وہ ۱۵ سال کے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں وہ جوان تھے۔ یزید بن المہلب' خالد بن عبداللہ القسری اور نصر بن سیار کی ولایتِ عراق کے طوفانی عہد' ان کی آنکھوں کے سامنے گزرے۔ ابن ہبیرہ آخری اموی گورنر کے ظلم و ستم کا وہ خود نشانہ بنے۔ پھر ان کے سامنے ہی عباسی دعوت اٹھی۔ اس کا مرکز ان کا اپنا شہر کوفہ تھا۔ اور بغداد کی تعمیر سے پہلے تک کوفے ہی کو عملاً نوخیز دولتِ عباسیہ کے مرکز کی حیثیت حاصل رہی۔ خلیفہ المنصور کے عہد میں ۱۵۰ھ (۷۶۷ء) میں انہوں نے وفات پائی۔

امام موصوفؒ کی تعلیم کے متعلق ان کا اپنا یہ بیان ہے کہ ابتداءً انہوں نے قراءت' حدیث' نحو' ادب' شعر' کلام وغیرہ تمام ان علوم کا مطالعہ کیا تھا جو اس زمانے میں متداول تھے۔

(۱)اس کے بعد انہوں نے علم کلام میں اختصاص پیدا کیا اور ایک مدت اس میں مشغول رہ کر اس مرتبے تک ترقی کر گئے کہ اس فن میں ان کی طرف نگاہیں اٹھنے لگیں۔ امام خود فرماتے ہیں:

"میں ایک ایسا شخص تھا جسے علمِ کلام کی بحثوں میں مہارت حاصل تھی۔ ایک زمانہ ایسا گزرا کہ میں انہی بحثوں اور مناظروں میں مشغول رہتا تھا۔ اور چونکہ اختلافات کا اکھاڑا زیادہ تر بصرہ میں تھا اس لئے تقریباً ۲۰ مرتبہ میں وہاں گیا اور کبھی کبھی سال چھ مہینے بھی وہاں رہ کر خوارج کے مختلف گروہوں، اباضیہ، سفریہ وغیرہ سے اور حشویہ کے مختلف حلقوں سے مناظرے کرتا رہا" (۲)

اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ امام نے اس وقت کے فلسفہ و منطق اور اختلافاتِ مذاہب کے متعلق بھی ضرور کافی واقفیت بہم پہنچائی ہوگی، کیونکہ اس کے بغیر علمِ کلام میں آدمی دخل نہیں دے سکتا۔ بعد میں انہوں نے قانون (فقہ) میں منطقی استدلال اور عقل کے استعمال کا جو کمال دکھایا اور بڑے بڑے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں جو شہرت حاصل کی وہ اسی ابتدائی ذہنی تربیت کا نتیجہ تھی۔

کافی مدت تک اس میں مشغول رہنے کے بعد کلامی جھگڑوں اور مجادلوں سے ان کا دل بیزار ہو گیا اور انہوں نے فقہ (اسلامی قانون) کی طرف توجہ کی۔ یہاں طبعاً ان کی دلچسپی اہل الحدیث (محدثین) کے مدرسۂ فکر سے نہ ہو سکتی تھی، عراق کے اصحاب الرائے (فقہاء) کا مرکز اس وقت کوفہ تھا۔ اسی سے وہ وابستہ ہو گئے۔ اس مدرسۂ فکر (School of thought) کی ابتدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (م ۳۲ھ / ۶۵۲ء) سے ہوئی تھی۔ ان کے بعد ان کے شاگرد شریح (م ۷۸ھ / ۶۹۷ء) علقمہ (م ۶۲ھ) اور مسروق (م ۶۳ھ / ۶۸۲ء) اس مدرسہ کے نامور ائمہ ہوئے، جن کا شہرہ اس وقت تمام دنیائے اسلام میں تھا۔ پھر ابراہیم نخعیؒ (م ۹۵ھ۔ ۷۱۴ء) اور ان کے بعد حضرت حماد تک اس کے امامت پہنچی۔ انہی حمادؒ کی شاگردی امام ابو حنیفہؒ نے اختیار کی اور ان کی وفات تک پورے ۱۸ سال ان کی صحبت میں رہے۔ مگر انہوں نے صرف اسی علم پر اکتفا نہ کیا جو کوفہ میں ان کے اساتذہ کے پاس تھا بلکہ بار بار حج کے موقع پر حجاز جا کر وہ فقہ اور حدیث کے دوسرے اکابر اہل علم سے بھی استفادہ کرتے رہے۔

۱۲۰ھ میں جب ان کے استاذ حضرت حمادؒ کا انتقال ہوا تو اس مدرسۂ فکر کے لوگوں نے بالاتفاق امام ابو حنیفہؒ کو ان کا جانشین بنایا اور اس مسند پر ۳۰ سال تک درس و تدریس اور افتاء کا وہ لافانی کام انہوں نے انجام دیا جو آج مذہب حنفی کی بنیاد ہے۔ اس تیس سال کی مدت میں انہوں

نے بقولِ بعض ۶۰ ہزار اور بقول بعض ۸۳ ہزار قانونی مسائل کے جوابات دیئے جو ان کی زندگی ہی میں الگ الگ عنوانات کے تحت مرتب کر دیئے گئے۔(۳) سات آٹھ سو کی تعداد میں ایسے شاگرد تیار کیے جو دنیائے اسلام کے مختلف علاقوں میں پہنچ کر درس و افتاء کے مسند نشین اور عوام کی عقیدتوں کے مرکز بن گئے۔ ان کے شاگردوں میں سے پچاس (۵۰) کے قریب ایسے آدمی نکلے جو ان کے بعد سلطنتِ عباسیہ کے قاضی (جج) بنے۔ ان کا مذہب اسلامی دنیا کے بہت بڑے حصے کا قانون بن گیا۔ وہی عباسی، سلجوقی، عثمانی اور مغل سلطنتوں کا قانون تھا' اور آج چین سے لے کر ترکی تک کے کروڑوں مسلمان اسی کی پیروی کرتے ہیں۔

معاش کیلئے امامؒ صاحب نے اپنا آبائی پیشہ تجارت اختیار کیا۔ کوفہ میں وہ خز (ایک خاص قسم کے کپڑے) کی تجارت کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے اس پیشے میں بھی غیر معمولی ترقی کی۔ ان کا اپنا ایک بڑا کارخانہ تھا جس میں خز تیار کیا جاتا تھا (۴) ان کی تجارتی کوٹھی (کمپنی) صرف کوفے ہی میں کپڑا فروخت نہیں کرتی تھی بلکہ اس کا مال دور دراز علاقوں میں بھی جاتا تھا۔ پھر ان کی دیانت پر عام اعتماد جب بڑھا تو یہ کوٹھی عملاً ایک بینک بھی بن گئی جس میں لوگ کروڑوں روپیہ امانت رکھواتے تھے۔ ان کی وفات کے وقت ۵ کروڑ درہم کی امانتیں اس کوٹھی میں جمع تھیں (۵) مالی و تجارتی معاملات کے متعلق اس وسیع تجربے نے ان کے اندر قانون کے بہت سے شعبوں میں وہ بصیرت پیدا کر دی تھی جو صرف علمی حیثیت سے قانون جاننے والوں کو نصیب نہیں ہوتی۔ فقہ اسلامی کی تدوین میں اس تجربے نے ان کو بڑی مدد دی۔ اس کے علاوہ دنیوی معاملات میں ان کی فراست و مہارت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ جب ۱۴۵ھ (۷۶۲ء) میں المنصور عباسی نے بغداد کی تعمیر کا آغاز کیا تو امام ابو حنیفہؒ ہی کو اس کی نگرانی پر مقرر کیا اور چار سال تک وہ اس کام کے نگرانِ اعلیٰ رہے۔(۶)

امام موصوف اپنی شخصی زندگی میں انتہائی پرہیزگار اور دیانت دار آدمی تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے شریک کو مال بیچنے کیلئے باہر بھیجا۔ اس مال میں ایک حصہ عیب دار تھا۔ امام نے شریک کو ہدایت کی کہ جس کے ہاتھ فروخت کرے اسے عیب سے آگاہ کر دے۔ مگر وہ اس بات کو بھول گیا ارو سارا مال عیب ظاہر کیے بغیر فروخت کر آیا۔ امام صاحب نے اس پورے مال کی وصول شدہ رقم (جو ۳۵ ہزار دراہم تھی) خیرات کر دی (۷) مؤرخین نے متعدد واقعات ایسے بھی نقل کیے ہیں کہ نا تجربہ کار لوگ اگر اپنا مال فروخت کرنے کیلئے ان کی دوکان پر آتے اور ان کی

قیمت کم بتاتے تو امام خود ان سے کہتے کہ تمہارا مال زیادہ قیمتی ہے اور ان کو صحیح قیمت ادا کرتے تھے۔(۸)ان کے ہمعصر ان کی پرہیزگاری کی تعریف میں غیر معمولی طور پر رطب اللسان ہیں۔ مشہور امام حدیث عبداللہ بن مبارکؒ کا قول ہے: ”میں نے ابو حنیفہؒ سے زیادہ پرہیزگار آدمی نہیں دیکھا۔ اس شخص کے متعلق کیا کہا جائے گا جس کے سامنے دنیا اور اس کی دولت پیش کی گئی اور اس نے ٹھکرا دیا۔ کوڑوں سے اسے پیٹا گیا اور وہ ثابت قدم رہا اور وہ مناصب جن کے پیچھے لوگ دوڑتے پھرتے ہیں کبھی قبول نہ کئے“(۹) قاضی ابن شبرمہ کہتے ہیں: ”دنیا ان کے پیچھے لگی مگر وہ اس سے دور بھاگے اور ہم سے وہ بھاگی مگر ہم اس کے پیچھے لگے“(۱۰) حسن بن زیادؒ کہتے ہیں: خدا کی قسم، ابو حنیفہؒ نے کبھی کسی امیر کا عطیہ یا ہدیہ قبول نہیں کیا“(۱۱) ہارون الرشید (عباسی خلیفہ) نے ایک دفعہ امام ابو یوسفؒ سے امام ابو حنیفہؒ کی صفت پوچھی۔ انہوں نے کہا:

> ”بخدا وہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے سخت پرہیز کرنے والے، اہل دنیا سے مجتنب اور اکثر خاموش رہنے والے آدمی تھے۔ ہمیشہ غور و فکر میں لگے رہتے تھے اور فضول باتیں کبھی نہ کرتے۔ اگر کوئی مسئلہ ان سے پوچھا جاتا اور ان کے پاس اس کے متعلق کوئی علم ہوتا تو جواب دے دیتے۔ امیر المؤمنین! میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ وہ اپنے نفس اور دین کو برائیوں سے بچاتے تھے اور لوگوں سے بے نیاز ہو کر اپنے آپ سے مشغول رہتے تھے۔ وہ کبھی کسی کا ذکر برائی کے ساتھ نہ کرتے تھے“(۱۲)

وہ ایک نہایت فیاض آدمی تھے۔ خصوصاً اہل علم پر اور طلبہ پر اپنا مال بڑی دریا دلی سے خرچ کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے تجارتی منافع کا ایک خاص حصہ اس مقصد کیلئے الگ کر رکھا تھا، جس سے سال بھر تک علماء اور طلبہ کو باقاعدہ مالی اعانتیں دیتے رہتے اور آخر میں جو کچھ بچتا وہ انہی میں تقسیم کر دیتے۔ وہ ان کو مال دیتے وقت کہا کرتے: ”آپ لوگ اسے اپنی ضروریات پر خرچ کریں اور اللہ کے سوا کسی کے شکر گزار نہ ہوں، میں نے آپ کو اپنے پاس سے کچھ نہیں دیا۔ یہ اللہ کا فضل ہے جو آپ لوگوں کیلئے ہی اس نے مجھ کو بخشا ہے“(۱۳)ان کے شاگردوں میں ایک کثیر تعداد ایسی تھی جن کے مصارف کی کفالت وہ خود کرتے تھے، اور امام ابو یوسفؒ کے تو گھر کا پورا خرچ ہی انہوں نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ کیونکہ ان کے والدین غریب تھے اور وہ اپنے لڑکے کو تعلیم سے ہٹا کر اسے کسی معاشی کام میں لگانا چاہتے تھے۔(۱۴)

اس سیرت اور شخصیت کا تھا وہ شخص جس نے دوسری صدی ہجری کے نصف اول میں

قریب قریب ان تمام اہم مسائل سے تعرض کیا جو خلافتِ راشدہ کے بعد پیش آنے والے حالات میں پیدا ہوئے تھے۔

بنیادی طور پر امام موصوف کوئی صاحبِ تصنیف آدمی نہ تھے۔ اس لئے ان کے کام کے متعلق زیادہ تر دوسرے معتبر ذرائع ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ لیکن شیعہ، خوارج، مرجیۂ اور معتزلہ کے اٹھائے ہوئے چند مسائل ایسے ہیں جن پر انہوں نے اپنی عادت کے خلاف خود قلم اٹھایا ہے اور اہل السنّت والجماعت (یعنی مسلم معاشرے کے سوادِ اعظم) کا عقیدہ و مسلک نہایت مختصر مگر واضح الفاظ میں مرتب کر دیا ہے۔ اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت اور بنی امیہ کے آغازِ سلطنت میں مسلمانوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہوئے تھے ان سے چار بڑے فرقے وجود میں آگئے تھے۔ جنہوں نے بعض ایسے مسائل پر انتہائی آراء کا نہ صرف اظہار کیا بلکہ ان کو مذہبی عقیدہ قرار دے دیا جو مسلم سوسائٹی کی ترکیب، اسلامی ریاست کی ہیئت، اسلامی قانون کے مآخذ، اور امت کے سابقہ اجتماعی فیصلوں کی مستند حیثیت پر اثر انداز ہوتے تھے۔ ان مسائل کے متعلق سوادِ اعظم کا مسلک اگرچہ متعین تھا، کیونکہ عام مسلمان اس پر چل رہے تھے، اور بڑے بڑے فقہا وقتاً فوقتاً اپنے اقوال و افعال سے بھی اس کا اظہار کرتے تھے، لیکن امام ابو حنیفہؒ کے وقت تک کسی نے اس کو دو ٹوک طریقے سے ایک واضح تحریر کی صورت میں مرتب نہیں کیا تھا۔

امام ابو حنیفہؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ''الفقہ الاکبر'' لکھ کر ان مذہبی فرقوں کے مقابلہ میں عقیدۂ اہل السنّت والجماعت کو ثبت کیا۔ اس طرح امام صاحب نے شیعہ، خوارج، اور معتزلہ و مرجیۂ کی انتہائی آراء کے درمیان ایک ایسا متوازن عقیدہ پیش کیا جو مسلم معاشرے کو انتشار اور باہمی تصادم و منافرت سے بھی بچاتا ہے اور اس کے افراد کو اخلاقی بے قیدی اور گناہوں پر جسارت سے بھی روکتا ہے۔ جس فتنے کے زمانے میں امام موصوف نے عقیدۂ اہل سنت کی یہ وضاحت پیش کی تھی، اس کی تاریخ کو نگاہ میں رکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ان کا بڑا کارنامہ تھا جس سے انہوں نے امت کو راہِ اعتدال پر قائم رکھنے کی سعی بلیغ فرمائی تھی۔ اس عقیدے کے معنی یہ تھے کہ امت اس ابتدائی اسلامی معاشرے پر پورا اعتماد رکھتی ہے جو نبی ﷺ نے قائم کیا تھا۔ اس معاشرے کے لوگوں نے جو فیصلے بالاتفاق یا اکثریت کے ساتھ کیے تھے، امت ان کو تسلیم کرتی ہے۔ جن اصحاب کو انہوں نے یکے بعد دیگرے خلیفہ منتخب کیا تھا، ان کی خلافت کو بھی اور ان کے زمانے کے فیصلوں کو بھی وہ آئینی حیثیت سے درست مانتی ہے۔ اور شریعت کے اس پورے علم کو بھی قبول کرتی ہے جو

اس معاشرے کے افراد (یعنی صحابہ کرامؓ) کے ذریعہ سے بعد کی نسلوں کو ملا ہے۔ یہ عقیدہ اگرچہ امام ابو حنیفہؒ کا اپنا ایجاد کردہ نہ تھا بلکہ امت کا سوادِ اعظم اس وقت یہی عقیدہ رکھتا تھا، مگر امام صاحب نے اسے تحریری شکل میں مرتب کر کے ایک بڑی خدمت انجام دی کیونکہ اس سے عام مسلمانوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ متفرق گروہوں کے مقابلہ میں ان کا امتیازی مسلک کیا ہے۔

قانونِ اسلامی کی تدوین: لیکن امام ابو حنیفہؒ کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے انہیں اسلامی تاریخ میں لازوال عظمت عطا کی، یہ تھا کہ انہوں نے اس عظیم خلا کو اپنے بل بوتے پر بھر دیا جو خلافتِ راشدہ کے بعد شوریٰ کا باب بند ہو جانے سے اسلام کے قانونی نظام میں واقع ہو چکا تھا۔ ایک صدی کے قریب اس حالت پر گزر جانے سے جو نقصان رونما ہو رہا تھا اسے ہر صاحبِ فکر آدمی محسوس کر رہا تھا۔ ایک طرف مسلم ریاست کے حدود سندھ سے اسپین تک پھیل چکے تھے۔ بیسیوں قومیں اپنے الگ الگ تمدن، رسم و رواج اور حالات کے ساتھ اس میں شامل ہو چکی تھیں۔ اندرون ملک مالیات کے مسائل، تجارت اور زراعت اور صنعت و حرفت کے مسائل، شادی بیاہ کے مسائل، دستوری اور دیوانی اور فوجداری قوانین و ضوابط کے مسائل روزبروز سامنے آرہے تھے۔ بیرون ملک دنیا بھر کی قوموں سے اس عظیم ترین سلطنت کے تعلقات تھے، اور ان میں صلح و جنگ، سفارتی روابط، تجارتی لین دین، بحری و بری مسافرت، کسٹم وغیرہ کے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ اور مسلمان چونکہ اپنا ایک مستقل نظریہ، اصولِ حیات اور بنیادی قانون رکھتے تھے، اس لئے ناگزیر تھا کہ وہ اپنے ہی نظامِ قانون کے تحت ان بے شمار نت نئے مسائل کو حل کریں۔ غرض ایک طرف وقت کا یہ زبردست چیلنج تھا جس سے اسلام کو سابقہ درپیش تھا۔ اور دوسری طرف حالت یہ تھی کہ ملوکیت کے دور میں کوئی ایسا مسلم آئینی ادارہ باقی نہ رہا تھا جس میں مسلمانوں معتمد علیہ اہل علم اور فقیہ اور مدبرین بیٹھ کر ان مسائل کو سوچتے اور شریعت کے اصولوں کے مطابق ان کا ایک مستند حل پیش کرتے جو سلطنت کی عدالتوں اور اس کے سرکاری محکموں کیلئے قانون قرار پاتا اور پوری مملکت میں یکسانی کے ساتھ اس پر عمل کیا جاتا۔

اس نقصان کو خلفاء، گورنر، حکام اور قاضی سب محسوس کر رہے تھے، کیونکہ انفرادی اجتہاد اور معلومات کے بل پر روزمرہ پیش آنے والے اتنے مختلف مسائل کو بروقت حل کر لینا ہر مفتی، حاکم، جج اور ناظمِ محکمہ کے بس کا کام نہ تھا۔ اور فرداً فرداً انہیں حل کیا بھی جاتا تھا تو اس سے بے شمار متضاد فیصلوں کا ایک انبار لگ رہا تھا۔ مگر دشواری یہ تھی کہ ایسا ایک ادارہ حکومت ہی قائم

کر سکتی تھی' اور حکومت ایسے ہاتھوں میں تھی جو خود جانتے تھے کہ مسلمانوں میں ان کا کوئی اخلاقی وقار واعتماد نہیں ہے۔ ان کیلئے فقہاء کا سامنا کرنا تو درکنار ان کو برداشت کرنا بھی مشکل تھا۔ ان کے تحت بننے والے قوانین کسی حالت میں بھی مسلمانوں کے نزدیک اسلامی نظامِ قانون کا جزو نہ بن سکتے تھے۔ ابن المقفع نے اپنے رسالہ ''الصحابہ'' میں اس خلا کو بھرنے کیلئے المنصور عباسی کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ خلیفہ اہل علم کی ایک کونسل بنائے جس میں ہر نقطۂ نظر کے علماء پیش آمدہ مسائل پر اپنا اپنا علم اور خیال پیش کریں' پھر خلیفہ خود ہر مسئلے پر اپنا فیصلہ دے اور وہی قانون ہو۔ لیکن منصور اپنی حقیقت سے اتنا بے خبر نہ تھا کہ یہ حماقت کرتا۔ اس کے فیصلے ابوبکرؓ اور عمرؓ کے فیصلے نہ بن سکتے تھے۔ ان کے فیصلوں کی عمر خود اس کی اپنی عمر سے زیادہ نہ ہو سکتی تھی۔ بلکہ اس کی زندگی میں بھی توقع نہ تھی کہ پوری مملکت میں کوئی ایک مسلمان ہی ایسا مل جائے گا جو اس کے منظور کیے ہوئے قانون کی مخلصانہ پابندی کرے۔ وہ ایک لادینی (Secular) قانون تو ہو سکتا تھا مگر اسلامی قانون کا ایک حصہ ہرگز نہ ہو سکتا تھا۔

اس صورت حال میں امام ابو حنیفہؒ کو ایک بالکل نرالا راستہ سوجھا اور وہ یہ تھا کہ وہ حکومت سے بے نیاز رہ کر خود ایک غیر سرکاری مجلس وضع قانون (Private legislature) قائم کریں۔ یہ تجویز ایک انتہائی بدیع الفکر آدمی ہی سوچ سکتا تھا' اور مزید برآں اس کی ہمت صرف وہی شخص کر سکتا تھا جو اپنی قابلیت پر' اپنے کردار پر' اور اپنے اخلاقی وقار پر اتنا اعتماد رکھتا ہو کہ اگر وہ ایسا کوئی ادارہ قائم کر کے قوانین مدون کرے گا تو کسی سیاسی قوتِ نافذہ (Political sanction) کے بغیر اس کے مدون کردہ قوانین اپنی خوبی' اپنی صحت' اپنی مطابقتِ احوال اور اپنے مدون کرنے والوں کے اخلاقی اثر کے بل پر خود نافذ ہوں گے' قوم خود ان کو قبول کرے گی اور حکومتیں از خود ان کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گی۔ امام کوئی غیب دان نہ تھے کہ پیشگی ان نتائج کو دیکھ لیتے جو فی الواقع ان کے بعد نصف صدی کے اندر ہی برآمد ہو گئے۔ مگر وہ اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو جانتے تھے' مسلمانوں کے اجتماعی مزاج سے واقف تھے اور وقت کے حالات پر گہری نظر رکھتے تھے' انہوں نے ایک کمال درجے کے دانا و دور اندیش انسان کی حیثیت سے بالکل صحیح اندازہ کر لیا کہ وہ اس خلا کو اپنی نجی حیثیت سے بھر سکتے ہیں اور ان کے بھرنے سے یہ خلا واقعی بھر جائے گا۔

اس مجلس کے شرکاء امام کے اپنے شاگرد تھے جن کو سالہا سال تک انہوں نے اپنے مدرسۂ قانون میں باقاعدہ قانونی مسائل پر سوچنے' علمی طرز پر تحقیقات کرنے اور دلائل سے نتائج مستنبط کرنے کی تربیت دی تھی۔ ان میں سے قریب قریب ہر شخص امام کے علاوہ وقت کے دوسرے بڑے بڑے اساتذہ

سے بھی قرآن، حدیث، فقہ اور دوسرے مددگار علوم، مثلاً لغت، نحو، ادب اور تاریخ و سیر کی تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ مختلف شاگرد مختلف علوم کے اختصاصی ماہر سمجھے جاتے تھے۔ مثلاً کسی کو قیاس و رائے میں نمایاں مقام حاصل تھا، کسی کے پاس احادیث اور صحابہؓ کے فتاوی اور پچھلے خلفاء و قضاۃ کے نظائر کی وسیع معلومات تھیں، اور کوئی علمِ تفسیر یا قانون کے کسی خاص شعبے، یا لغت اور نحو یا مغازی کے علم میں اختصاص رکھتا تھا۔ ایک دفعہ امام نے خود اپنی ایک گفتگو میں بتایا کہ یہ کس مرتبے کے لوگ تھے:

"۳۶ آدمی ہیں جن میں سے ۲۸ قاضی، جج، ہونے کے لائق ہیں۔ ۶ فتوی دینے کی اہلیت رکھتے ہیں، اور دو اس درجے کے آدمی ہیں کہ قاضی اور مفتی تیار کر سکتے ہیں" (۱۵)

اس مجلس کا طریقِ کار جو امام کے معتبر سوانح نگاروں نے لکھا ہے وہ ہم خود انہی کے الفاظ میں یہاں نقل کرتے ہیں۔ الموفق بن احمد المکی (م ۵۶۸ھ۔ ۱۱۷۲ء) لکھتا ہے:

"ابو حنیفہؒ نے اپنا مذہب ان کے (یعنی اپنے فاضل شاگردوں کے) مشورے سے مرتب کیا ہے۔ وہ اپنی حدِ وسع تک دین کی خاطر زیادہ سے زیادہ جانفشانی کا جذبہ رکھتے تھے اور خدا اور رسول خدا ﷺ اور اہل ایمان کے لئے جو کمال درجہ کا اخلاص ان کے دل میں تھا اس کی وجہ سے انہوں نے شاگردوں کو چھوڑ کر یہ کام محض اپنی انفرادی رائے سے کر ڈالنا پسند نہ کیا۔ وہ ایک ایک مسئلہ ان کے سامنے پیش کرتے تھے، اس کے مختلف پہلوان کے سامنے لاتے تھے، جو کچھ ان کے پاس علم اور خیال ہوتا اسے سنتے اور ان پر رائے بھی بیان کرتے، حتی کہ بعض اوقات ایک ایک مسئلے پر بحث کرتے ہوئے مہینہ مہینہ بھر اور اس سے بھی زیادہ لگ جاتا تھا۔ آخر جب ایک رائے قرار پا جاتی تو اسے قاضی ابو یوسفؒ کتب اصول میں ثبت کرتے" (۱۶)

ابن بزاز الکردری (صاحب فتاوی بزازیہ (م ۸۲۷ھ۔ ۱۴۲۴ء) کا بیان ہے:

"امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد ایک ایک مسئلے پر خوب دل کھول کر بحث کرتے اور ہر فن کے نقطہ نظر سے گفتگو کرتے۔ اس دوران میں امام خاموشی کے ساتھ ان کی تقریریں سنتے رہتے تھے۔ پھر جب امام زیر بحث مسئلے پر اپنی تقریر شروع کرتے تو مجلس میں ایسا سکوت ہوتا جیسے یہاں ان کے سوا کوئی اور نہیں بیٹھا" (۱۷)

"عبد اللہ بن مبارکؒ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ اس مجلس میں تین دن مسلسل ایک مسئلے پر بحث ہوتی رہی۔ تیسرے دن شام کے وقت میں نے جب اللہ اکبر کی آوازیں سنیں

تو پتہ چلا کہ اس بحث کا فیصلہ ہو گیا ہے"(۱۸)

اس کے ساتھ المکی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس مجلس کے جو فیصلے لکھے جاتے تھے ان کو الگ الگ عنوانات کے تحت کتابوں اور ابواب میں مرتب بھی امام ابو حنیفہؒ کی زندگی ہی میں کر دیا گیا تھا :

"ابو حنیفہؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس شریعت کے علم کو مدون کیا۔ ان سے پہلے کس نے یہ کام نہیں کیا تھا۔۔۔ ابو حنیفہؒ نے اس کو کتابوں اور جدا جدا عنوانات کے تحت ابواب کی شکل میں مرتب کر دیا تھا"(۱۹)

اس مجلس میں جیسے کہ ہم پہلے المکی ہی کے حوالہ سے بتا چکے ہیں کہ ۸۳ ہزار قانونی مسائل طے کیے گئے تھے۔ اس میں صرف وہی مسائل زیر بحث نہیں آتے تھے جو اس وقت تک لوگوں کو یا ریاست کو عملاً پیش آچکے تھے' بلکہ معاملات کی امکانی صورتیں فرض کر کے ان پر بھی بحث کی جاتی اور ان کا حل تلاش کیا جاتا تھا' تاکہ آئندہ اگر کبھی کوئی نئی صورت پیش آجائے جو اب تک پیش نہ آئی ہو تو قانون میں پہلے سے اس کا حل موجود ہو۔ یہ مسائل قریب قریب ہر شعبۂ قانون سے متعلق تھے۔ بین الاقوامی قانون(۲۰) جس کیلئے السیر کی اصطلاح مستعمل تھی) دستوری قانون' دیوانی وفوجداری قانون' قانونِ شہادت' ضابطہ عدالت' معاشی زندگی کے ہر شعبہ کے الگ قوانین' نکاح وطلاق اور وراثت وغیرہ شخصی احوال کے قوانین' اور عبادات کے احکام' یہ سب عنوانات ہم کو ان کتابوں کی فہرستوں سے ملتے ہیں جو اس مجلس کے فراہم کردہ مواد سے امام ابو یوسفؒ نے اور پھر امام محمد بن حسن الشیبانیؒ نے بعد میں مرتب کیں۔

اس باقاعدہ تدوینِ قانون(Codification) کا اثر یہ ہوا کہ انفرادی طور پر یہ کام کرنے والے مجتہدوں' مفتیوں اور قاضیوں کا کام ساقط الاعتبار ہوتا چلا گیا۔ قرآن وحدیث کے احکام اور سابقہ فیصلوں اور فتاوی کے نظائر کی چھان بین کر کے اہلِ علم کی ایک مجلس نے امام ابو حنیفہؒ جیسے نکتہ رس آدمی کی صدارت ورہنمائی میں شریعت کے جو احکام منقح صورت میں نکال کر رکھ دیئے تھے' اور پھر اصولِ شریعت کے تحت وسیع پیمانے پر اجتہاد کر کے ہر پہلو میں پیش آنے والی امکانی ضرورتوں کیلئے جو قابل عمل قوانین مرتب کر دیے تھے' ان کے بعد متفرق افراد کے مدون کیئے ہوئے احکام مشکل ہی سے وقیع ہو سکتے تھے۔ اس لئے جونہی یہ کام منظرِ عام پر آیا عوام' حکام اور قضاۃ' سب اس کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو گئے' کیونکہ یہ وقت

کی مانگ تھی اور لوگ مدت سے اس چیز کے حاجت مند تھے۔ چنانچہ مشہور فقیہ یحی بن آدم(م ۲۰۳ھ۔ ۸۱۸ء) کہتے ہیں کہ :ابو حنیفہؒ کے اقوال کے آگے دوسرے فقہاء کے اقوال کا بازار سرد پڑ گیا' انہی کا علم مختلف علاقوں میں پھیل گیا' اسی پر خلفاء' ائمہ اور حکام فیصلے کرنے لگے اور معاملات کا چلن اسی پر ہو گیا(۲۱) خلیفہ مامون (۱۹۸۔ ۲۱۸ھ مطابق ۸۱۳۔ ۸۳۳ء) کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے یہ حالت ہو گئی کہ ایک دفعہ وزیر اعظم فضل بن سہل کو امام ابو حنیفہؒ کے ایک مخالف فقیہہ نے مشورہ دیا کہ حنفی فقہ کا استعمال بند کرنے کے احکام جاری کر دیئے جائیں۔ وزیر اعظم نے باخبر اور معاملہ فہم لوگوں کو بلا کر اس معاملے میں رائے لی۔ انہوں نے بالاتفاق کہا: "یہ بات نہیں چلے گی اور سارا ملک آپ لوگوں پر ٹوٹ پڑے گا۔ جس شخص نے آپ کو یہ مشورہ دیا ہے وہ ناقص العقل ہے۔ وزیر اعظم نے کہا: میں خود بھی اس خیال سے متفق نہیں ہوں اور امیر المؤمنین بھی اس پر راضی نہ ہوں گے۔(۲۲)

اس طرح تاریخ کا یہ اہم واقعہ رونما ہوا کہ ایک شخص واحد کی قائم کی ہوئی نجی مجلس وضعِ قوانین کا مرتب کیا ہوا قانون محض اپنے اوصاف اور اپنے مرتب کرنے والوں کی اخلاقی ساکھ کے بل پر ملکوں اور سلطنتوں کا قانون بن کر رہا۔ اس کے ساتھ دوسرا اہم نتیجہ اس کا یہ بھی ہوا کہ اس نے مسلم مفکرین قانون کیلئے اسلامی قانون کی تدوین کا ایک نیا راستہ کھول دیا۔ بعد میں جتنے بڑے بڑے فقہی نظام بنے اوہ اپنے طرز اجتہاد اور نتائج اجتہاد میں چاہے اس سے مختلف ہوں' مگر ان کیلئے نمونہ یہی تھا جسے سامنے رکھ کر ان کی تعمیر کی گئی۔(۲۳)

امام ابو حنیفہؒ کے اس منفرد علمی و تحقیقی کام سے فقہ حنفی کا آغاز ہوا۔ امام ابو حنیفہؒ کی فقہ کی امام مالکؒ' امام احمد بن حنبلؒ اور امام شافعیؒ نے بہت حوصلہ افزائی فرمائی اور اس سے استفادہ کیا۔ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ: "سارے لوگ فقہ میں امام ابو حنیفہؒ کے اہل و عیال ہیں"

فقہ حنفی کی امتیازی خصوصیات

جیسا کہ ہم پہلے وضاحت کر چکے ہیں کہ تدوین فقہ (اسلامی قانون) کی ابتداء دوسری صدی ہجری کے ربع اول میں ہوئی۔ اس کام کا آغاز امام ابو حنیفہؒ (۸۰ھ۔ ۱۵۰ھ) نے کیا۔ ان کے فوراً بعد امام مالک بن انس (۹۳ھ۔ ۱۷۰ھ) نے بھی قرآن و سنت کی روشنی میں قوانینِ اسلام کو مرتب کیا۔ ان دونوں حضرات کے کچھ عرصے بعد امام محمد بن ادریس الشافعیؒ (۱۵۰ھ۔ ۲۰۴ھ) اور امام احمد بن حنبلؒ ۱۶۴ھ۔ ۲۴۱ھ)اور بعض دوسرے فقہاء نے بھی انہی خطوط پر کام کیا۔

تاہم ایک مستقل فن کی حیثیت سے باقاعدہ مدون ہونے کی اولیت کا شرف فقہ حنفی کو حاصل ہے۔ اس طرح فقہ حنفی درج ذیل کئی امتیازی خصوصیات کی حامل ہے۔

(۱) مصالح پر نظر: فقہ حنفی کی ایک قابل قدر امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جن مسائل کو زیر بحث لاتی ہے' اور ان کا حکم بیان کرتی ہے' ظاہری سیاق و سباق سے زیادہ اس کے مصالح' اسرار و حکم اور قابل عمل ہونے پر غور کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ شرعی احکام کے متعلق اسلام کے عہد اول ہی میں دو نقطۂ نظر سامنے آگئے تھے' ایک گروہ کی رائے تھی کہ احکام تعبدی ہیں (یعنی ان میں کوئی حکمت اور مصلحت تلاش کرنا ضروری نہیں) اللہ نے اور اللہ کے رسول ﷺ نے جس چیز سے منع کیا ہے اس سے رک جانا چاہیے اور جس امر کے بجالانے کا حکم دیا ہے' اس کی بے چون وچرا تعمیل کرنی چاہئیے۔ ظلم' دھوکہ' خیانت' سود' رشوت اور شراب نوشی اس لئے ناپسندیدہ ہیں کہ شریعت نے ان سے منع کیا ہے۔ رحم' عدل وانصاف' سچ' دیانت وامانت اور دوسروں کی مدد کرنا اس لیے پسندیدہ ہیں کہ شارع نے انہیں اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ امام شافعی اسی نقطہ نظر کی طرف مائل ہیں۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ شریعت کے تمام احکام مصلحتوں اور حکمتوں پر مبنی ہیں۔ مثلاً نماز کی اہمیت و فرضیت کو بیان کیا تو اس کے ساتھ اس کا مقصد بھی واضح کیا کہ نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔ روزہ کی فرضیت کا ذکر آیا تو اس کی یہ حکمت بیان کی کہ انسان میں پرہیزگاری اور حسنِ اخلاق کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ جہاد کی مصلحت و حکمت یہ بیان کی کہ: اللہ کی زمین سے بدامنی اور فساد کا خاتمہ ہو' لوگ امن و سکون اور عزت و آبرو کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ اسی طرح قرآن وحدیث میں بے شمار احکام کے ساتھ ان کے مصالح' مقاصد اور غرض وغایت کی صراحتیں موجود ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ اس دوسرے نقطۂ نظر کے قائل تھے۔

انھوں نے نصوص کے علاوہ جن مسائل میں اجتہاد واستنباط کیا ہے وہاں شریعت کے مقصد اور عوام کی مصلحت کو ملحوظ رکھا ہے۔ ان کے اسی اندازِ استدلال کا یہ نتیجہ اور اثر ہے کہ تمام مسالکِ فقہ میں فقہِ حنفی عقلی اصول اور طرزِ استدلال کے زیادہ قریب ہے۔ امام طحاویؒ (م ۳۲۱ھ) نے جو محدث بھی تھے اور مجتہد بھی' اور حنفی المسلک تھے' اپنی شہرہ آفاق کتاب "شرح معانی الآثار" کے نام سے ایک مستقل اور ضخیم کتاب لکھی ہے اور مرکزی موضوع اسی کو بنایا ہے کہ فقہِ حنفی حدیث اور عقلی استدلال دونوں کے مطابق ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے مشہور شاگرد امام محمدؒ

بن حسن نے اپنی تصنیف "کتاب الحجۃ" یا "کتاب الحج" میں فقہِ حنفی کے اکثر مسائل پر عقلی انداز میں استدلال کیا ہے۔

حنفی مسلک کے مطابق لکھی جانے والی کتاب "الہدایہ" کا انداز بھی یہی ہے۔ جہاں امام ابو حنیفہؒ نے باقی ائمہ مجتہدین سے اختلاف کیا ہے، وہاں صاحب ہدایہ حنفی مسلک کی تائید میں ایک دلیل قرآن یا سنت سے دیتے ہیں، اور ایک دلیل خالصتاً عقلی نقطہ نظر سے پیش کرتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کی آراء کو عقلی انداز میں ثابت کرنے اور دوسرے مسالک پر ترجیح دینے میں "ہدایہ" کا اسلوب اور طریق کار بذاتِ خود انتہائی عقلی اور فلسفیانہ ہے۔ اسی طرح مشہور حنفی فقیہ علامہ ابو بکر علاؤالدین الکاسانیؒ (م ۵۸۷ھ) نے بھی اپنی معروف کتاب "بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع" (۷ جلدیں) میں حنفی مسلک کو عقلی و نقلی انداز میں پیش کیا ہے۔

اس لحاظ سے فقہ حنفی کا دوسری کسی بھی فقہ سے تقابل کیا جائے تو یہ فرق روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ معاملات تو معاملات، عبادات میں بھی جن کے بارے میں ظاہر بینوں اور غور و فکر سے عاری لوگوں کا خیال ہے کہ ان میں عقل کا کوئی کام نہیں ہے، فقہ حنفی نے وہاں بھی عقل کو نظر انداز نہیں کیا ہے، بلکہ احکام کا جس انداز میں تجزیہ کیا ہے وہ عقل کے عین مطابق ہے۔

نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج اسلام کے بنیادی ارکان ہیں۔ اگر اس نقطہ نظر سے غور کیا جائے کہ شریعت نے ان اعمال کی بجا آوری کن مصلحتوں کی بنا پر فرض کی ہے اور ان کی بجا آوری کا کیا طریقہ ہونا چاہیئے تو بلاشبہ وہی طریقہ زیادہ موزوں، سہل، قابل عمل اور عقلِ سلیم کے مطابق ثابت ہو گا جو فقہ حنفی میں متعین کیا گیا ہے۔ مثلاً نماز چند افعال کے مجموعہ کا نام ہے۔ لیکن اس لحاظ سے کہ نماز کی غرض و غایت کیا ہے؟ یعنی خشوع و خضوع، اظہارِ بندگی، اللہ کی بزرگی کا اظہار اور دعا۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے میں نماز کے کس عمل کی کیا حیثیت ہے، اور ان کے مراتب میں کس حد تک تفاوت ہے؟ ان افعال میں بعض اس حد تک ضروری ہیں کہ ان کے چھوٹ جانے سے نماز کی بنیادی غرض و غایت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ بعض ارکان ایسے ہیں کہ انہیں سکون و وقار کے ساتھ ادا نہ کرنے سے نہ مجموعی عمل متاثر ہوتا ہے اور نہ کلی طور پر غرض و غایت فوت ہوتی ہے۔ ان افعال کا مرتبہ پہلی قسم کے افعال سے کم ہے اور ان کو سنت اور مستحب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے جبکہ پہلی قسم کے افعال کو فرض اور واجب کا نام دیا جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے از خود ان افعال کا تجزیہ کر کے نہیں بتایا کہ فلاں عمل فرض ہے،

فلاں سنت' اور فلاں مستحب ہے لیکن یہ حقیقت سب کے نزدیک مسلم تھی کہ نماز کے تمام افعال یکساں درجہ نہیں رکھتے۔ اس لیے مجتہدین نے اپنے اجتہاد کی رو سے ان کے مراتب کا تعین کیا' اور ان کے الگ الگ نام رکھے۔ اصولی اور بنیادی طور پر امام ابو حنیفہؒ نے بھی ایسا ہی کیا۔ بلکہ انہوں نے جس طرح بہت سے دوسرے مسائل میں عقلی استدلال کو اس حد تک ملحوظ رکھا کہ ان کی فقہ میں زیادہ وسعت گہرائی اور گیرائی پیدا ہو گئی' اور ہر قسم کے معاشرے اور ہر دور کی سوسائٹی میں ان کے وضع کردہ اصول و ضوابط پر عمل کرنا زیادہ آسان ہو گیا۔ یہاں بھی انہوں نے دیگر ائمہ کی نسبت شریعت کے حکم (نماز) کی غرض و غایت اور مقصودِ اصلی پر گہری نظر رکھتے ہوئے مختلف ارکان کے مختلف مراتب متعین کیے۔ مثلاً سب سے پہلے ان ارکان کا تعین ضروری تھا جن کے بغیر نماز ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ بات تمام مجتہدین کے نزدیک مسلم ہے کہ نماز اصل میں اقرارِ بندگی اور اظہارِ خشوع و خضوع کا نام ہے۔ اور اس کیلئے نیت' تکبیر' قراءت' رکوع و سجود ضروری ہیں۔ کیونکہ اظہارِ عبودیت کا اس سے بہتر اور واضح طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ لہذا ان کو" فرض" قرار دیا گیا (خود شارع نے بھی ان کے فرض اور لازمی ہونے کی طرف اشارے کیے ہیں) دوسرے ائمہ نے ان ارکان کی ادائیگی کی خصوصیات کو بھی فرض قرار دیا حالانکہ ان خصوصیات کا لحاظ فرض کے درجہ میں نہیں تھا۔ امام ابو حنیفہؒ نے اصل ارکان کی ادائیگی اور ان کی خصوصیات کی ادائیگی میں فرق کیا۔ کیونکہ خصوصیات کو اصل کا درجہ دینا شریعت کے منشاء اور مزاج کے مطابق بھی نہ تھا' اور اس سے لوگوں کو ایک گونہ مشقت میں ڈالنا بھی لازم آتا ہے جو بجائے خود شریعت کے منشاء و مزاج کے خلاف ہے۔

(۲) لوگوں کیلئے آسانی: فقہ حنفی کی مابہ الامتیاز ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ حتی الامکان عوام الناس کیلئے آسانی پیدا کرتی ہے اور انہیں تنگی و مشکل سے بچاتی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے شریعت کے بنیادی اصول: "یُرِیْدُاللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَایُرِیْدُبِكُمُ الْعُسْرَ" (۲۴) کو یہاں تک مد نظر رکھا کہ ذاتی رائے کے طور پر فرمادیا: اگر کوئی شخص قرآنی الفاظ اور عبارت کی ادائیگی سے مجبور ہے اور قرآن کا متن عربی تلاوت نہیں کر سکتا تو وہ نماز میں اس کا ترجمہ پڑھ سکتا ہے (۲۵) جبکہ امام شافعیؒ وغیرہ کے نزدیک ترجمہ سے کسی حالت میں نماز ادا نہیں ہو سکتی۔ فقہ حنفی کا یہ امتیاز فطرت انسانی کے کس قدر قریب ہے کہ جب تک آدمی عربی متن پڑھنے پر قادر نہ ہو اسے ادائیگی نماز سے محروم نہیں کرتی۔

زکواۃ اسلام کا دوسرا بنیادی رکن ہے۔ ایک خاص طبقہ (نصاب کا حامل مالدار طبقہ) پر زکوٰۃ فرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نسلِ انسانی کے ان افراد کی امداد و اعانت اور دستگیری کی جائے جو مستقل یا عارضی طور پر ضرورت اور احتیاج کا شکار ہو گیا ہے۔ اسی لیے قرآن نے زکواۃ کی ادائیگی کے جو آٹھ مصارف بیان کیے ہیں ان میں فقراء اور مساکین کو مقدم رکھا ہے۔

یہاں بھی امام ابو حنیفہؒ نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ انتہائی سائنٹفک، قابلِ عمل اور لوگوں کی آسانی پر مبنی ہے، وہ اس طرح کہ شافعی مسلک کی رو سے آٹھوں مصارف میں ہر صاحب نصاب کے لیے زکواۃ کا روپیہ تقسیم کرنا ضروری ہے جبکہ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ زکواۃ دینے والا یہ دیکھے کہ معاشرے میں ان آٹھ طبقوں میں جو قرآن نے بیان کیے ہیں، کون سا طبقہ زیادہ ضرورت مند ہے۔ جو طبقہ زیادہ مستحق ہو زکواۃ اسی کو دی جائے۔ عملی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض معاشرے ایسے ہیں کہ ان میں قرآن کے بیان کردہ آٹھوں طبقے موجود ہی نہیں ہوتے۔ اس لیے امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ زکواۃ تقسیم کرنے والا خواہ فرد ہو یا اسلامی ریاست، اس کی صواب دید پر ہے کہ وہ آٹھ مصارف میں سے جس مصرف میں یا جن مصارف میں زکواۃ ادا کرنا زیادہ مناسب سمجھے انہی میں تقسیم کر دے۔

امام ابو حنیفہؒ کے اس اجتہاد کی تائید سیدنا عمر فاروقؓ کے اس فیصلے سے ہوتی ہے جو انہوں نے اپنے دورِ خلافت میں کیا تھا کہ تالیف قلب کیلئے کسی کو زکواۃ نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ ان کے خیال میں اس وقت عملی طور پر یہ طبقہ (مؤلفۃ القلوب) موجود نہیں تھا۔

زکوٰۃ ہی کے بارے میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ جانوروں کی زکوٰۃ میں اسلامی ریاست جانور ہی وصول کرے گی یا مالک کو اختیار ہے کہ وہ قیمت ادا کر دے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک جانوروں کی زکوٰۃ میں جانور دینا یا لینا ہی ضروری ہے، ان کی قیمت نہیں دی جا سکتی۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جانور بھی دیے جا سکتے ہیں اور قیمت بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے زکوٰۃ کی فرضیت، اس کی وصولی کی غرض و غایت اور لوگوں کے لئے آسانی کو ملحوظ رکھا۔ اور یہ چیز دونوں صورتوں میں حاصل ہو جاتی ہے بلکہ بعض حالات میں خاص طور پر موجودہ دور میں جانوروں کی وصولی سے کہیں زیادہ بہتر اور آسان طریقہ یہی ہے کہ قیمت وصول کر لی جائے۔

ہم نے صرف دو ایسی مثالوں پر اکتفا کیا ہے جو اسلام کے بنیادی ارکان سے متعلق ہیں ورنہ ان کے علاوہ بے شمار مثالیں ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ فقہ حنفی میں مسئلہ کے ظاہر سے

زیادہ اس کی غرض و غایت اور لوگوں کی مصلحت و آسانی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

(۳) اجتماعی فقہ: فقہ حنفی کی تیسری امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ امام ابو حنیفہؒ کی ذاتی اور شخصی رائے پر مبنی نہیں ہے۔ تدوین فقہ کیلئے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ انہوں نے قانون ساز اسمبلی کی طرز پر ایک پرائیویٹ مجلس فقہاء تشکیل دی، جس کے ارکان کی تعداد چالیس تھی۔ یہ تمام ارکان مختلف علوم وفنون کے ماہر تھے۔ قانونِ اسلامی کی ترتیب و تدوین میں جتنے علوم وفنون کے ماہرین کی ضرورت تھی، وہ سب اس مجلس میں جمع تھے۔ کوئی علوم قرآن کا ماہر تھا تو کوئی علم حدیث کا، کسی کی لغت پر گہری نظر تھی تو کوئی علم الانساب میں درجۂ کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ کوئی قاضی اور مفتی کے منصب پر فائز تھا۔ اس مجلس فقہ میں بطور خاص ایسے افراد بھی شامل کیے گئے تھے جن کی معاشرے کے گوناگوں اور نو بہ نو مسائل پر گہری نظر تھی۔ ایسے افراد بھی تھے جو لوگوں کے رسم و رواج اور عرف و عادت سے بخوبی واقف تھے۔ فقہِ حنفی کی تدوین کا یہ امتیاز کسی اور فقہ کو حاصل نہیں ہے۔

(۴) تابعیت ابو حنیفہؒ: فقہِ حنفی کی باقی تینوں اماموں کی فقہ کے مقابلہ میں ایک اہم امتیازی خصوصیت، امام ابو حنیفہؒ کا تابعی ہونا بھی ہے۔ تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ نے کئی صحابہ کی زیارت کی ہے اور ان سے شرفِ ملاقات حاصل کیا ہے۔ قرآن، حدیث اور اجماع امت سے یہ بات ثابت ہے کہ صحابہ کرام کے بعد تابعین کا درجہ ہے، اور تابعی ہونے کا شرف اور برتری تمام فقہاء اور مجتہدین میں امام ابو حنیفہؒ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے۔

امام جلال الدین سیوطیؒ لکھتے ہیں:

> ''امام عبدالکریم شافعیؒ نے ایک مختصر رسالہ لکھا ہے جس میں ان حدیثوں کو جمع کیا ہے جو ابو حنیفہؒ نے براہِ راست صحابہ سے روایت کی ہیں۔ اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ کتنی احادیث روایت کی ہیں۔ جب صحابہ سے براہِ راست حدیث کی روایت ثابت ہو گئی تو صحابہ سے ملنا اور انہیں دیکھنا بدرجہ اولی ثابت ہو گیا۔ اور اس طرح ابو حنیفہؒ کی تابعیت شک و شبہ سے بالاتر ہو گئی'' (۲۶)

(۵) بے مثال فقاہت کا نمونہ: فقہ حنفی کی ایک امتیازی خوبی ہے کہ اس کے بانی عقل، فہم و فراست، زہد و تقوی اور قوتِ استنباط میں ان کی حیثیت اس حد تک مسلم تھی کہ ان کے ناقدین بھی اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ جن مسائل کے حل میں ان کے ہم عصر

علماء عاجز و درماندہ ہوئے' انہیں امام ابو حنیفہؒ کی نکتہ رسی نے حل کیا۔ امام شافعیؒ جو خود بھی امام مجتہد کی حیثیت سے ابھرے' اور جنہوں نے علم الفقہ کے اصول و ضوابط کی ترتیب و تدوین میں منفرد اور بلند مقام حاصل کیا' امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ : سب لوگ (یعنی اہل علم) فقہ اور مسائل کے اخذ و استنباط میں ابو حنیفہؒ کی آل اولاد ہیں۔ سفیان ثوریؒ کہتے ہیں کہ : ہم (علماء حدیث و فقہ) ابو حنیفہؒ کے سامنے ایسے تھے جیسے ایک چڑیا' اور معمولی پرندہ باز کے سامنے ہوتا ہے' بلاشبہ وہ تمام علماء کے سردار تھے (۲۷)

(۶) اولین مدونِ فقہ : کتاب و سنت کے براہ راست علم' خلفاء راشدین' صحابہ اور تابعین کے فتاوی اور فیصلوں کی روشنی میں قوانین اسلام کو سب سے پہلے امام ابو حنیفہؒ نے مرتب کیا۔ بغیر کسی استثناء کے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کسی سے رہنمائی حاصل نہیں کی' وہ دوسروں کیلئے روشنی اور رہنمائی کا مینار تھے۔ ان کے بعد آنے والے تمام فقہاء اور مجتہدین نے ان کے مرتب کردہ اصول و قواعد سے استفادہ کیا۔ شیخ جلال الدین سیوطی جو شافعی المسلک ہیں' اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> "جن فضائل میں ابو حنیفہؒ منفرد ہیں ان میں ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ وہ اولین شخص ہیں جنہوں نے قرآن و سنت کے علوم و مسائل کو مدون کیا' اور انہیں موضوع کے اعتبار سے مختلف ابواب میں ترتیب دیا۔ امام مالکؒ نے اپنی کتاب "الموطا" کی تدوین میں ابو حنیفہؒ کی پیروی کی۔ قانون شریعت کو ابو حنیفہؒ سے پہلے کسی نے مرتب و مدون نہیں کیا۔ کیونکہ صحابہ و تابعین کا اعتماد قوتِ حافظہ پر تھا۔ ابو حنیفہؒ نے پہلی بار محسوس کیا کہ ان کے علوم' فتاوی' فیصلے اور آراء منتشر ہیں۔ اگر ان کو جمع کر کے مرتب نہ کیا گیا اور باقاعدہ تدوین کی شکل نہ دی گئی تو مستقبل میں ان کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ آئندہ لوگوں میں نہ ایسا حافظہ رہے گا اور نہ زہد و تقوی اور نہ دین کے موضوع میں احتیاط رہے گی۔ اس لئے ابو حنیفہؒ نے علمِ شریعت کو موضوع وار ابواب و فصول میں مرتب کر دیا" (۲۸)

امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں امام مالکؒ کی یہ گواہی کافی ہے کہ : ابو حنیفہؒ کی صورت میں میں نے ایک ایسا آدمی دیکھا ہے کہ اگر وہ اس مٹی کے ستون کو اپنی قوتِ استدلال کی بنا پر سونے کا ثابت کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ (۲۹)

(۷) شخصی آزادی کی رعایت: یہ فقہ حنفی کی اہم ترین خصوصیت ہے' جو کسی دوسری فقہ میں کم ہی پائی جاتی ہے۔ یہ اہم خصوصیت ہم اس مسئلہ میں دیکھ سکتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ بالغ عورت کو ولی کے بغیر بذات خود اپنا نکاح کرنے کا حق دیتے ہیں۔(۳۰) جبکہ دوسرے فقہی مذاہب میں نکاح کے معاملہ میں عورت کی آزادی انتہائی محدود ہے۔

اسی طرح یہ خصوصیت سفیہ (نادان آدمی جو اپنے حقوق ملکیت میں صحیح تصرف کرنے کا اہل نہ ہو) پر پابندی عائد کرنے کی ممانعت کے بارے میں نظر آتی ہے۔ چنانچہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک نادان آدمی جب ۲۵ سال کی عمر کو پہنچ جائے تو اس پر پابندی عائد نہیں کی جاسکتی اور اس کا مال اس کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ جبکہ اس سے پہلے اس کے قولی تصرفات کو اس کے مال میں معتبر سمجھا جائے گا۔(۳۱) اسی طرح امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مفلس مقروض کے تصرفات پر بھی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی(۳۲) جبکہ دیگر فقہاء کے نزدیک نہ تو نادان آدمی کو اس کا مال حوالے کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کے مال میں اس کے تصرفات نافذ ہوں گے' اور اسی طرح مفلس مقروض پر اپنے مال میں تصرف کرنے پر پابندی عائد کی جائے گی۔ اور قاضی کو حق حاصل ہے کہ جبراً اس کا مال فروخت کر دے۔ اس سلسلہ میں امام ابو حنیفہؒ کا استدلال یہ ہے کہ اس پر اس طرح کی پابندی عائد کرنے سے اس کی آزادی' گفتگو اور آدمیت مجروح ہو گی۔(۳۳)

(۸) حقوق اللہ میں احتیاط: فقہ حنفی میں حقوق اللہ کے ضمن میں احتیاط کے پہلو کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً دوران نماز گفتگو کرنے سے نماز' خواہ بھول کر ہی ہو' اور قرآن مجید سے دیکھ کر قراءت کرنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ دورانِ نماز قہقہہ لگانے سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے۔ دس ذوالحجہ کو مناسک حج کی ترتیب واجب ہے' کسی بھی صورت میں روزہ توڑنے کا کفارہ لازم ہے' اور اسی طرح حرمت رضاعت کے باب میں مطلق رضاعت کو معتبر قرار دیا گیا ہے' ایک قطرہ بھی حرمت کا موجب ہے۔

(۹) مسلمان کی طرف گناہ کی نسبت سے اجتناب: فقہ حنفی کی یہ امتیازی خصوصیت دو مسئلوں میں نمایاں طور پر سامنے آتی ہے: ایک مسلمان کی تکفیر کا مسئلہ اور دوسرے اثباتِ نسب کا مسئلہ۔ چنانچہ کسی مسلمان کو کافر قرار نہیں دیا جائے گا خواہ کفر کی

ننانوے (۹۹) علامات کے مقابلہ میں اس کے اندر ایمان کی صرف ایک علامت اور وجہ ہی ہو۔ (۳۳ الف) ایسا ہی ثبوت نسب کے مسئلہ میں ہو گا۔ قاضی ابو زید دبوسی فرماتے ہیں :

"ہمارے نزدیک اصل قاعدہ یہ ہے کہ ثبوتِ نسب کا اعتبار اس پر ہو گا کہ بچہ باپ کے بستر پر پیدا ہوا ہے یعنی اس حالت میں ہوا ہے کہ اس کی ماں اس آدمی کی زوجیت میں تھی، نہ کہ اس بنا پر نسب ثابت ہو گا کہ بچے کی ماں سے ہم بستری کس نے کی ہے۔ جبکہ امام شافعیؒ کے نزدیک نسب کے ثبوت کا اعتبار حقیقی طور پر ہم بستری کرنے پر قدرت کی بنا پر ہو گا (۳۴)

(۱۰) احکام تجارت میں مہارت : تجارت کے معاملہ میں نصوص شرعیہ اس تفصیل کے ساتھ بیان نہیں ہوئیں جس تفصیل کے ساتھ عبادات اور مناکحات کے بارے میں بیان ہوئی ہیں۔

یہ بات معلوم ہے کہ امام ابو حنیفہؒ خز کے کپڑے کے بہت بڑے تاجر تھے۔ وہ تجارت کے اسالیب کی باریکیوں اور اس میں جھگڑوں کے اسباب سے علمی طور پر بخوبی واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ حنفی میں تجارتی احکام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ ماہرانہ تفاصیل، جزئی احکام اور انتہائی مفصل نظریات کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ یہ عمومیت اور مہارت دیگر فقہی مذاہب میں موجود نہیں ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس نے متنوع اور مختلف ضروریات کے لیے فقہ حنفی کو سب سے زیادہ قابل قبول بنا دیا ہے جس کا مشاہدہ ہم دورِ حاضر کے تجارتی معاملات میں کر رہے ہیں۔ مثلاً بیع سلم کی شرائط کی تفاصیل، اور گوشت کی صورت میں اس کا عدمِ جواز، غیر منقولہ جائیداد کی بیع کی صورت میں قبضہ کا عدمِ وجوب، احتکار (ذخیرہ اندوزی) کے جواز اور حرمت کے بارے میں تفصیلات وغیرہ۔

(۱۱) غیر مسلموں کے ساتھ مدارات : مذہب حنفی میں دیگر اہل مذاہب کے ساتھ بہت زیادہ وسعت اور رعایت کا پہلو پایا جاتا ہے۔ جو قاضی ابو زید الدبوسیؒ کے بیان کردہ اس اصول سے واضح ہے کہ :

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اصل قاعدہ یہ ہے کہ اہلِ ذمہ کو ان کے معتقدات اور ان کے مذاہب کے معاملہ میں آزادی ہو گی، جبکہ صاحبین (ابو یوسفؒ، محمدؒ) کے نزدیک ان کو ان کے مذہب کی آزادی نہیں ہو گی (۳۵)

اسی طرح امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ذمی کو مسلم کے بدلے میں اور مسلمان کو ذمی کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ اسی طرح مسلمان اور ذمی کی دیت ان کے نزدیک برابر ہے۔

(۱۲) عصری مسائل کا حل: فقہِ حنفی کی ایک اہم خصوصیت اور امتیاز یہ ہے کہ موجودہ سائنسی اور ترقی یافتہ دور میں یہ زیادہ قابل عمل' آسان اور عقل وفطرت کے زیادہ قریب ہے۔ اس میں اتنی لچک' وسعت' آفاقیت اور گہرائی وگیرائی موجود ہے کہ یہ ہر دور کے مسائل کو حل کرنے کی اپنے اندر صلاحیت رکھتی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ اور ان کے مدرسہ فکر کے فقہاء نے عصری مسائل اور پیش آمدہ نئے مسائل کے حل کیلئے "استحسان" کا طریقہ اختیار کیا اور اس کی بنیاد پر استنباط مسائل کا سب سے زیادہ کام کیا اور قیاس ظاہر میں غلو کی وجہ سے مصلحتِ عامہ میں جب کوئی مشکل پیش آتی ہے' تو استحسان کے ذریعہ استنباط کر کے ان فقہاء نے انتہائی انصاف اور اعتدال پر مبنی مہارت فن کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ امام کے شاگرد رشید امام محمد بن حسنؒ شیبانی کہتے ہیں :

"ان اصحابه كانوا ينازعونه المقاييس فاذاقال استحسن لم يلحق به احد"(۳۶)

(امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد' قیاسی معاملات میں ان کے ساتھ ردو قدح کرتے تھے لیکن جب وہ کہہ دیتے کہ میں نے استحسان کیا ہے تو پھر اس تک کوئی نہ پہنچ پاتا)

اسی بنا پر امام محمدؒ نے استحسانی مسائل سے واقفیت کو دیگر معتبر دلائل کی طرح شرائط اجتہاد میں سے شمار کیا ہے(۳۷)

ڈاکٹر مصطفےٰ الزرقاء نے استحسان کے بارے میں احناف کے نقطہ نظر کی ترجمانی یوں کی ہے :

"التفات الى مقاصد الشريعة العامة فى ابتغاء الاصلح"(۳۸)

(یعنی پیش آمدہ مسائل کے حل کیلئے زیادہ بہتر حکم کی تلاش میں شریعت کے عمومی مقاصد کو ملحوظ رکھنا استحسان ہے)

نئے مسائل کے احکام دریافت کرنے کے عمل میں جب عام نظائر اور مشابہ احکام کے حوالہ سے مطلوبہ رہنمائی نہ ملے تو اس صورت میں مصلحت اور عدل کی بنیاد پر ان نظائر سے انحراف کرتے ہوئے ان مسائل کا حل تلاش کیا جائے گا۔(یہ صورت استحسان بالقیاس الخفی اور استحسان بالمصلحة کہلاتی ہے۔)

بعض اوقات معروضی حالات' معاشرتی فساد یا طبعی اعذار کے سبب اصل حکم پر عمل دشوار ہو جاتا ہے۔ اس وقت کوئی ایسی صورت تلاش کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے جس میں حکم کا احترام قائم رکھتے ہوئے سہولت کی راہ نکالی جا سکے۔ اگر اس صورت میں شارع کی طرف سے اصل حکم

کی کوئی متبادل نوعیت نہ ہو تو اجتہاد کے ذریعہ دفع مشقت کے پیش نظر احکام میں سہولت پیدا کی جائے گی، اور یہی استحسان کا مقصد ہے (اس قسم کو استحسان بالضرورۃ کا عنوان دیا جاتا ہے۔)

الغرض شرعی احکام کی تطبیق اور موقع و محل متعین کرنے، درپیش مسائل کی تحقیق اور موجود مسائل کے بقاء و تسلسل اور ان کو حل کرنے میں عام ضوابط اور قیاس کے برعکس عدل، مصلحت، سماحت و رحمت، تدبر و تفکر، یسر و سہولت اور دفع حرج جیسے عمومی مقاصد شریعت کی بنیاد پر فقیہانہ ترجیح (Juristic Prefrence) کو استحسان کہتے ہیں۔

چند عصری مسائل اور ان کا حل

ذیل میں ان چند عصری مسائل کو پیش کیا جارہا ہے جن سے فقہ حنفی کی یہ خصوصیت واضح نمایاں ہوتا ہے کہ یہ ہر دور کے مسائل کو حل کرنے کی صلاحت رکھتی ہے:

۱۔ عورت کی جان بچانے کیلئے اسقاط حمل کی اجازت ہے:

اگر کسی دیندار خدا ترس ماہر ڈاکٹر نے حاملہ عورت کی جان بچانے کیلئے اسقاط حمل کی تجویز دی تو اس پر عمل در آمد کی اجازت ہے۔ خواہ بچہ میں جان پڑ چکی ہو۔ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے بچہ کو ضائع کرنا کسی صورت درست نہیں ہے جس میں جان پڑ چکی ہو اور یہ قتل سے مشابہ صورت ہے۔

لیکن استحسان کی وجہ ضرورت ہے کہ عورت کی جان بچانا جنین کی زندگی سے زیادہ اہم ہے۔ (۳۹)

۲۔ جسمانی عیب کے ازالہ کیلئے عمل جراحی درست ہے:

اگر کسی شخص کو کوئی جسمانی عیب لاحق ہے اور اس کے ازالہ کیلئے کسی سرجری کی ضرورت ہو تو اس کی گنجائش فقہِ حنفی میں موجود ہے۔ مثلاً کسی کے ہاتھ یا پاؤں میں زائد انگلی ہو تو اسے عملِ جراحی کے ذریعہ علیحدہ کیا جاسکتا ہے۔

قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ درست نہ ہو، کیونکہ انسان کو جسمانی اور ذہنی اذیت دینا شرعاً جائز نہیں ہے کیونکہ انسان ایک قابلِ احترام مخلوق ہے۔

لیکن استحسان کی وجہ یہ مصلحت ہے کہ اللہ تعالی نے انسان کو معاشرت پسند بنایا ہے اور وہ اشیاء جو اس کیلئے اس معاملہ میں رکاوٹ بنتی ہیں ان کا ازالہ اس کیلئے کسی حد تک ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن اس معاملہ میں افراط و تفریط سے بچنا ضروری ہے۔ نہ تو یہ ہو کہ انسان اپنے

عیوب کا ازالہ ہی نہ کریں اور نہ یہ کہ انسان بلاوجہ زینت وزیبائش کیلئے مصنوعی طریقے استعمال کرے۔ چنانچہ یہ درست نہیں کہ جسم کو گودواکر اسے جاذب نظر بنایا جائے یا دانتوں میں مصنوعی خلیج پیدا کر کے کسی فیشن کو اپنایا جائے۔ اسی طرح اس امر سے بھی منع نہیں کیا گیا کہ انسان اپنے جسم میں موجود کسی خامی کا ازالہ کرے خواہ اسے اس میں وقتی اذیت کا سامنا ہو۔

۳۔ ضرورت مند کو خون منتقل کرنا اور بلڈ بنک کا قیام درست ہے :

ایک انسان کا خون دوسرے ضرورت مند انسان کو منتقل کرنا جائز ہے۔

قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ درست نہ ہو، کیونکہ خون انسانی جسم کا جزو ہے۔ اور انسانی جزو سے فائدہ اٹھانا حرام ہے۔ نیز خون نجس ہے اور نجس سے فائدہ اٹھانا بھی درست نہیں ہے۔

لیکن استحسانِ ضرورت کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی صحت کی حفاظت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ لہذا انسانی جسم کو مرض سے نجات دلانے اور بسا اوقات اسے موت کے منہ سے بچانے کیلئے سوائے اس کے اور کوئی صورت ممکن نہیں ہوتی کہ اس کو انسانی خون منتقل کیا جائے۔ اس لیے از روئے ضرورت انسانی جسم میں دوسرے انسان کا خون منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس معاملے کی نوعیت بالکل ایسی ہے جیسے دودھ سے 'عورت کا جزوِ بدن ہونے کے ناطے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ لیکن چونکہ بچہ کی نشوونما کا دارومدار اسی پر ہے۔ اس لیے از روئے ضرورت اجازت دی گئی ہے کہ وہ عورت کا دودھ پیئے۔ اسی طرح خون کا بلا ضرورت استعمال درست نہ ہوگا۔ اس حوالہ سے فتاوی عالمگیری کی یہ عبارت کافی رہنمائی کرتی ہے :

"ولا باس بان یسعط الرجل بلبن المراۃ ویشربہ للدواء"(۴۰)

(اس میں کوئی حرج نہیں کہ علاج کی غرض سے مرد کے ناک میں عورت کا دودھ ڈالا جائے یا اسے دواء کیلئے پلایا جائے)

اور اگر رضاکارانہ بنیادوں پر خون دستیاب نہ ہو تو اس کی خرید وفروخت درست ہے۔

قیاس کا تقاضا ہے کہ یہ درست نہ ہو، اس لیے کہ خون انسان کا جزو ہے اور انسانی اجزاء قابل احترام ہیں۔ ان کی خرید وفروخت درست نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ مرغینانیؒ کے الفاظ ہیں :

"لان الادمی مکرم لا مبتذل فلا یجوز ان یکون شئی من اجزائہ مھانا مبتذلا"(۴۱)

(اس لیے کہ آدمی قابل عزت ہے، بے وقعت نہیں لہذا یہ درست نہیں کہ اس کے اجزاء میں سے کوئی چیز ذلیل اور بے وقعت ہو)

لیکن استحسان کی وجہ ضرورت ہے کہ انسانی زندگی کا دارومدار اسی پر ہے۔ لہذا اس کا حصول کسی بھی قیمت پر درست ہے۔ تاہم فروخت کنندہ کیلئے قیمت لینا پاکیزہ اور طیب نہ ہوگا۔ جیسے سور کے بالوں کے بارے میں فقہی جزئیہ ہے :

"اذاکان لایوجد الا بالبیع جازبیعه لکن الثمن لا یطیب للبائع" (۴۲)
(اگر سور بغیر بیع کے میسر نہ ہو تو اس کی بیع جائز تو ہوگی مگر اس کی قیمت فروخت کرنے والے کیلئے پاکیزہ نہ ہوگی)

علاوہ ازیں خون بھی انسانی دودھ کی مانند ہی ایک جزو ہے اور انسانی دودھ کے بارے میں باقاعدہ عقد درست ہے کہ بچے کو دودھ پلانے کیلئے کسی عورت کی خدمات باقاعدہ معاوضہ پر لی جائیں۔ اس سلسلے میں الهدایہ کی عبارت قابل غور ہے :

"ان العقدیقع علی اللبن والخدمة تابعة ولهذالوارضعته بلبن شاةلا یستحق الاجر" (۴۳)
(عقد اور معاہدہ دودھ پر ہوا ہے اور بچے کی دیکھ بھال اس کے تابع اور ضمنی ہے۔ اس لئے اگر عورت بچے کو بکری کا دودھ پلائے تو وہ اجرت کی مستحق نہ ہوگی)

الغرض اس حوالہ سے بلڈ بنک قائم کرنے کی گنجائش فقہ حنفی میں موجود ہے۔ کیونکہ صورتِ حال یہ ہے کہ انسان کسی وقت بھی مہلک بیماری میں مبتلا ہو سکتا ہے اور اسے خون کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہی خون اس کیلئے موزوں ہو سکتا ہے جو اس کے خون کے گروپ سے تعلق رکھتا ہو۔ اور بوقت ضرورت خون کے مناسب گروپ کے ملنے میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔ نیز رضاکارانہ بنیادوں پر خون کا مہیا ہونا بسا اوقات کارے دارد ہوتا ہے۔ اس لئے ضرورت پیش آتی ہے کہ ایسا بلڈ بنک قائم کیا جائے جس میں مختلف گروپوں کے خون کا ذخیرہ موجود ہو جہاں سے ضرورت کے وقت خون معاوضہ پر یا بلا معاوضہ حاصل کیا جا سکے۔

(۴) <u>جانوروں پر میڈیکل ریسرچ کی اجازت ہے</u> :

دورِ حاضر میں مختلف بیماریوں کے علاج دریافت کرنے اور ان کی آزمائش کیلئے جانوروں پر تجربات کئے جاتے ہیں۔ ان میں پہلے بیماری کے جراثیم داخل کیے جاتے ہیں اور پھر ممکنہ دوائیں کو آزما کر صحیح علاج دریافت کیا جاتا ہے۔ جانوروں پر اس قسم کے تجربات درست ہیں۔ قیاس کا تقاضا ہے کہ یہ تجربات درست نہ ہوں کیونکہ ان کے ذریعے جانداروں کو اذیت پہنچائی جاتی ہے جو کہ درست عمل نہیں ہے۔ لیکن استحسان کی وجہ یہ مصلحت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں سمیت

تمام اشیاء انسان کے فائدے کیلئے پیدا کی ہیں۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے :

''هُوَالَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا''(۴۴)

(وہی ہے جس نے تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے' تمام کا تمام پیدا کیا ہے)

''اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْکَبُوْامِنْهَاوَمِنْهَاتَاْ کُلُوْنَ وَلَکُمْ فِیْهَامَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْاعَلَیْهَا حَاجَةً فِیْ صُدُوْرِکُمْ وَعَلَیْهَا وَعَلَی الْفُلْکِ تُحْمَلُوْنَ''(۴۵)

(اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے مویشی بنائے تاکہ تم ان میں سے کچھ پر سواری کرو اور ان میں سے کچھ کو تم کھاتے بھی ہو اور تمہارے لئے ان میں اور بھی بہت سے فائدے اور تاکہ تم ان پر سوار ہو کر اپنی اس ضرورت تک پہنچو جو تمہارے سینوں میں ہے اور تم ان پر اور کشتی پر بھی لدے لدے پھرتے ہو)

گویا جانور' انسان کے ہمہ نوعیت کے فوائد بشمول خوراک' لباس' سواری اور علاج کیلئے ہی وجود میں لائے گئے ہیں۔ لہٰذا ان پر انسانی فائدے کے پیش نظر طبّی تحقیق بھی کی جا سکتی ہے۔ چونکہ اس میں اذیت کا پہلو ثانوی ہے اور انسانی مصلحت کا مقصد اولین حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس مقصد کو ترجیح حاصل ہو گی۔

(۵) **ملاوٹ شدہ خوراک و ادویات کو ضائع کر دیا جائے گا :**

کسی شخص کے پاس ملاوٹ شدہ دودھ وغیرہ ہے تو اس دودھ کو بہا دیا جائے گا۔

قیاس کا تقاضا ہے کہ اس دودھ کو ضائع نہ کیا جائے کیونکہ اس میں دودھ کے مالک کا نقصان ہے اور کسی کو مالی نقصان پہنچانا درست نہیں لیکن ضروری مصلحت کا تقاضا ہے کہ اس دودھ کو ضائع کر دیا جائے کیونکہ ملاوٹ شدہ دودھ وغیرہ فروخت کرنے کی صورت میں کئی افراد کی صحت کو نقصان پہنچے گا۔ اور اکثر افراد کی مضرت کا ازالہ' ایک فرد کی مضرت کے ازالہ پر مقدم ہے۔ جیسے نبی کریم ﷺ نے احتکار (اشیاء صرف پر اجارہ داری) سے منع کیا ہے کہ اس میں چند افراد کے نفع کے مقابلہ میں زیادہ افراد کا نقصان ہے۔(۴۶)

(۶) **خنزیر کے بالوں سے بوقت ضرورت سلائی کی جا سکتی ہے :**

خنزیر کے بالوں سے ایسی چیزوں میں سلائی کا کام لیا جا سکتا ہے کہ جہاں اس کا کوئی متبادل نہ ہو۔ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ' یہ درست نہ ہو کیونکہ خنزیر نجس العین ہے یعنی وہ تمام تر اجزاء سمیت ناپاک ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس کی اور اس کے تمام اجزاء کی خرید و فروخت ناجائز ہے۔

لیکن استحسان کی وجہ ضرورت اور درپیش مسائل کا حل ہے کہ بعض اشیاء کی سلائی اس کے بالوں کے بغیر نہیں ہو سکتی' اس لیے ضرورت کے تحت اس کی اجازت دی گئی ہے۔ اس حوالہ سے یہ بال بنیادی طور پر غیر مباح قرار پاتے ہیں۔ اس لیے اس کی خرید و فروخت کی ضرورت نہیں۔ تاہم اگر جوتے ساز یہ بال خریدے بغیر حاصل نہ کر سکتے ہوں تو انہیں بقدر ضرورت خریدنے کی اجازت ہے۔(۴۷)

الغرض عصرِ حاضر میں اسلامی قانون سازی کے عمل میں اور دورِ جدید کے نت نئے پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کے ضمن میں فقہ حنفی کی اہمیت و صلاحیت سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ حکومتی اور اجتماعی سطح پر احکامِ اسلام کے نفاذ کا مرحلہ جب بھی آئے گا' اس کیلئے فقہ حنفی سے زیادہ مضبوط' سائنٹفک' موجودہ سائنسی اور ترقی یافتہ دور کے جدید مسائل کے حل کیلئے وسیع تر اساس کوئی بھی فقہی مسلک مہیا نہیں کر سکے گا۔

فقہ حنفی کی اساس۔ قرآن و سنت

آخر میں بعض غیر مقلدین 'یک چشم اور قرآن و حدیث کے نام نہاد مدعیان کے اس پروپیگنڈے یا غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ "فقہ حنفی کی بنیاد قرآن و سنت سے ہٹ کر محض قیاس پر ہے"

اس سلسلہ میں سب سے پہلے حنفی فقہ کے بانی اور مؤسس امام اعظم ابو حنیفہؒ کے اپنے اقوال مستند کتابوں سے نقل کیے جاتے ہیں اور پھر ان کے فقہی اصول کی تشریح کی جائے گی۔

خطیب بغدادیؒ (م ۴۶۳ھ) نے سند کے ساتھ امام ابو حنیفہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ :

"اخذ بكتاب الله فمالم اجد فبسنة رسول الله ﷺ فان لم اجد فی کتاب الله وسنة رسول الله ﷺ اخذت بقول اصحابه اخذ بقول من شئت منهم وادع من شئت منهم فلا اخرج من اقوالهم الى اقوال غيرهم فاما اذا انتهى الامر الى ابراهيم وابن سيرين والحسن وعطاء وسعيد بن المسيب وعدد رجالا اجتهدوا فاجتهد كما اجتهدوا"(۴۸)

(میں اللہ کی کتاب پر عمل کرتا ہوں' جب مجھے اس میں کوئی حکم نہیں ملتا تو پھر میں رسول

اللہ ﷺ کی سنت کو لیتا ہوں۔ اگر مجھے کتاب و سنت دونوں میں کوئی حکم نہ ملے تو پھر میں اصحاب رسولؐ کے قول کو لیتا ہوں' ان میں سے جس کے قول کو چاہتا ہوں لیتا ہوں اور جس کے قول کو چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں' مگر ان کے اقوال سے باہر نکل کر کسی اور کا قول نہیں لیتا۔ لیکن جب بات ابراہیم نخعیؒ' ابن سیرین' حسن بصری' عطاء' سعید بن مسیّب اور اس درجے کے دوسرے افراد تک پہنچ جائے' جنہوں نے بھی اجتہاد کیا تھا۔ لہذا میں بھی اجتہاد کروں گا جس طرح کہ انہوں نے اجتہاد کیا تھا)

فضیل بن عیاضؒ (م ۱۸۷ھ) نے امام ابو حنیفہؒ کا طریقہ اجتہاد اس طرح نقل کیا ہے:

"امام ابو حنیفہؒ کے پاس جب کوئی مسئلہ آجاتا جس کے بارے میں صحیح حدیث موجود ہوتی تو آپؒ اس کا اتباع کرتے اگرچہ وہ صحابی کا قول ہی ہوتا' مگر جب کوئی حدیث (مرفوع یا موقوف) نہ ملتی تو پھر آپ قیاس کرتے تھے اور بڑے اچھے طریقے سے قیاس کرتے تھے" (۴۹)

عبداللہ بن مبارکؒ نے امام ابو حنیفہؒ کا قول اس طرح نقل کیا ہے:

"اذاجاء الحديث عن النبی ﷺ فعلى الراس والعين واذاجاء عن الصحابة تخيرناواذاجاء عن التابعين زاحمنا هم (۵۰)

جب نبی کریم ﷺ کی کوئی حدیث ہم تک پہنچے تو وہ بسر و چشم تسلیم ہے اور جب صحابہ کے اقوال ہمارے پاس پہنچیں تو ہم ان میں سے کسی ایک رائے کو پسند کریں گے مگر جب تابعین کے اقوال ہمارے سامنے آجائیں تو ہم ان کی مزاحمت بھی کر لیتے ہیں (یاد رہے کہ امام موصوف خود بھی تابعی ہیں)

نعیم بن عمرو فرماتے ہیں کہ:

"سمعت اباحنيفةؒ يقول عجباللناس يقولون انی افتی بالرای مافتی الا بالاثر" (۵۱)

(میں نے امام ابو حنیفہؒ کو یہ فرماتے سنا: تعجب ہے لوگ کہتے ہیں کہ میں اپنی رائے سے فتوی دیتا ہوں حالانکہ میں تو حدیث پر فتوے دیتا ہوں) (۵۲)

امام زفر بن ہذیلؒ (م ۱۵۸ھ) کا قول ہے کہ:

"مخالفین کی باتوں پر توجہ نہ دو: ابو حنیفہؒ اور ہمارے دوسرے اصحاب کسی بھی مسئلے میں کوئی بات نہیں کرتے تھے مگر قرآن و سنت اور صحابہ کے صحیح اقوال کے مطابق کرتے تھے اور پھر ان کے بعد ان پر قیاس کرتے تھے" (۵۳)

حسن بن زیاد متوفی ۲۰۴ھ کا قول ہے کہ :

"کان ابو حنیفة یروی اربعة آلاف حدیث الفین الحماد والفین لسائر المشیخة(۵۴)

(امام ابو حنیفہؒ چار ہزار احادیث کے راوی تھے۔ دو ہزار حماد سے اور دو ہزار باقی اساتذہ سے)

امام احمدؒ، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ سے تو قولِ صحابی کے عدم حجیت کے اقوال منقول ہیں بلکہ شافعیہ کے ہاں عدم حجیت کا قول متداول بھی ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ سے مروی تمام روایات اس بات پر متفق ہیں کہ آپ کتاب و سنت اور اجماع کے بعد صحابی کے قول کو اپنے قیاس پر ترجیح دیتے تھے۔ اسی طرح امام موصوف سے یہ بات بھی منقول نہیں ہے کہ قیاس پر خبر واحد کی تقدیم کیلئے اس کے راوی کا فقیہہ ہونا شرط ہے بلکہ یہ ایک قولِ مستحدث یعنی بعد میں بنایا گیا) ہے۔(۵۵)

امام ابو حنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کے ان مستند اقوال سے فقہ حنفی کی جو بنیاد اور اس کے اصول و مصادر ثابت ہوئے وہ یہ ہیں :

کتاب اللہ، حدیث رسول، اجماعِ امت، اقوال صحابہ، قیاس واجتہاد۔

امام ابو حنیفہؒ قرآن، سنت اجماع اور قولِ صحابی سے کسی مسئلے کا حکم معلوم نہ کر سکنے کی صورت میں بدرجہ آخر قیاس واجتہاد پر فتوی دیتے تھے۔ امام موصوف نے فرمایا ہے :

"اللہ کی قسم : جھوٹ بولتا ہے اور ہم پر الزام لگاتا ہے جو کہتا ہے کہ ہم قیاس کو نص پر مقدم سمجھتے ہیں۔ کیا نص کی موجودگی میں قیاس کی ضرورت پڑسکتی ہے ؟ ہم تو ضرورت کے بغیر قیاس نہیں کرتے"(۵۶)

موفق الدین مکیؒ نے زھیر بن معاویہ سے نقل کیا ہے کہ :

"ایک روز ابو حنیفہؒ اور ابیض بن اغر کسی قیاسی مسئلے پر مباحثہ فرما رہے تھے کہ مسجد کے ایک کونے سے ایک شخص نے جو میرے خیال میں مدینے کا رہنے والا تھا بآوازِ بلند کہا : یہ کیا قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں ؟ قیاس تو سب سے پہلے ابلیس نے کیا تھا۔ امام ابو حنیفہؒ نے کہا : تیری یہ بات بے محل ہے اور بے موقع ہے۔ ابلیس نے قیاس کے ذریعے اللہ کا حکم رد کر دیا تھا اور ہم غیر منصوص مسئلے کو قرآن و سنت اور اجماعِ امت میں سے کسی اصل پر قیاس کرتے ہیں اور اتباع کیلئے اجتہاد کرتے ہیں۔ تو ہمارے اور ابلیس کے قیاس کے درمیان کیا مناسبت ہے ؟ یہ جواب سن کر اس شخص نے کہا : اللہ آپ کے دل کو نور سے بھر دے جس طرح کہ آپ نے میرے دل کو نور سے

منور کر دیا ہے یعنی شکوک کا ازالہ کر دیا ہے" (۵۷)

فقہ حنفی علوم قرآن و حدیث میں غوطہ زن کسی ایک فکر کی کاوش نہیں ہے بلکہ اس کے تاروپود میں سینکڑوں افکارِ سلیمہ کی نکتہ آفرینیاں شامل ہیں اور اس کے حلقے میں بیسیوں استعدادیں اور صلاحیتیں منسلک تھیں جن کی نگران حضرت امام اعظمؒ کی فکرِ خداداد تھی۔ افسوس ہے عہد حاضر کے کج فکر اور کور چشم لوگوں کی حالتِ زار پر جن کے طبقے میں ایسی ایک فکرِ سلیم بھی نہیں ہے جو چشم بینا کے ساتھ دلِ بینا کے مظاہر کی بھی امین ہو۔ مگر وہ فقہ حنفی کی مخالفت کر کے اور اس پر یہ بے بنیاد الزام تھوپ کر کہ "یہ قرآن و سنت سے ہٹ کر قیاس پر مبنی ہے" ایسی بیسیوں صحت مند اور سلیم فکروں کا انکار کرتے ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک قیاس نصِ قرآنی یا حدیث غیر ضعیف پر تو کیا' حدیث ضعیف پر بھی مقدم نہیں ہے۔ مثلاً آپ نے سفر میں نبیذ تمر کے ساتھ وضوء کرنے کی حدیث کو اس کے ضعیف ہونے کے باوجود قیاس پر مقدم رکھا ہے۔ امام موصوف نے دس درہم سے کم مالیت کی چوری پر چور کا ہاتھ کاٹنے سے منع کیا ہے حالانکہ اس بارے میں جو حدیث ہے ضعیف ہے۔ آپ کے نزدیک حیض کی زیادہ سے زیادہ مدت دس دن ہے حالانکہ اس بارے میں جو حدیث ہے وہ ضعیف ہے۔ آپ نے اقامتِ جمعہ کیلئے شہر کو شرط قرار دیا ہے حالانکہ اس بارے میں بھی حدیث ضعیف ہے۔ آپ نے کنوؤں کے مسائل میں قیاس کو ترک کیا حالانکہ اس بارے میں بھی جتنے آثار ہیں وہ غیر مرفوعہ ہیں۔

قیاس سے متعلق امام باقرؒ اور امام ابو حنیفہؒ میں مکالمہ :

خانوادۂ رسول ﷺ کے چشم و چراغ حضرت امام باقرؒ کے پاس کسی نے حضرت امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں جھوٹا پروپیگنڈا کیا تھا کہ امام ابو حنیفہؒ اپنی رائے اور قیاس کو حدیثِ رسول ﷺ پر ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ جب پہلی بار مدینہ منورہ میں امام باقرؒ امام ابو حنیفہؒ سے ملے تو اس وقت ان دونوں عظیم شخصیات کے درمیان مذکورہ مسئلہ پر تفصیلی گفتگو ہوئی جس کے اختتام پر حضرت امام باقرؒ حضرت امام ابو حنیفہؒ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ آپ نے امام ابو حنیفہؒ کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ آیئے وہ شاندار مکالمہ ملاحظہ فرمایئے :

حضرت امام باقرؒ : کیا آپ وہ ہیں جس نے قیاس سے میرے نانا کے دین کو بدل دیا ہے ؟

حضرت امام ابو حنیفہؒ : معاذ اللہ ! اس کے بعد آپ نے کہا' آپ تشریف رکھیں اور ایسی شان سے

بیٹھیں جو آپ کے شایانِ شان ہے تاکہ میں اپنی حیثیت کے مطابق بیٹھوں کیونکہ میرے نزدیک آپ کا وہی مقام و مرتبہ اور عزت واحترام ہے جو آپ کے نانا حضرت محمد ﷺ کا اپنی حیاتِ ظاہری میں صحابہ کرامؓ کے نزدیک تھا۔ چنانچہ حضرت امام باقرؒ تشریف فرما ہوئے تب امام ابو حنیفہؒ ان کے سامنے دوزانو بیٹھ گئے اور کہا: میں آپ سے تین مسائل دریافت کرتا ہوں۔ آپ جواب ارشاد فرمائیں:

سوال نمبر ۱: مرد کمزور ہے یا عورت؟

امام باقرؒ: عورت مرد کی نسبت کمزور ہے۔

امام ابو حنیفہؒ: عورت کیلئے وراثت کے لحاظ سے کتنے حصے ہیں؟

امام باقرؒ: مرد کے دو حصے ہیں اور عورت کا ایک حصہ ہے۔

امام ابو حنیفہؒ: یہ تمہارے نانا کا فرمان ہے۔ اگر میں قیاس سے تمہارے نانا کے دین کو تبدیل کرنے والا ہوتا تو میرے لیے یہ مناسب تھا کہ میں کہتا مرد کا ایک حصہ ہے اور عروت کے دو حصے ہیں کیونکہ عورت مرد کے مقابلہ میں کمزور ہے (اور شرعاً کمزور کو زیادہ حصہ ملنا چاہیے کیونکہ قوی تو خود بھی اچھا کما سکتا ہے) حالانکہ میں نے یہ قیاس نہیں کیا۔

سوال نمبر ۲: پھر آپ نے پوچھا: پیشاب زیادہ پلید ہے یا نطفہ؟

امام باقرؒ: پیشاب زیادہ پلید ہے۔

امام ابو حنیفہؒ: اگر میں تمہارے نانا کے دین کو قیاس سے تبدیل کرتا ہوتا تو میں یہ حکم دیتا کہ پیشاب کرنے کے بعد غسل فرض ہو جاتا ہے اور انزال منی کے بعد وضوء سے بھی طہارت حاصل ہو سکتی ہے (کیونکہ زیادہ نجس چیز کے خروج کے بعد غسل فرض ہونا چاہیے اور وہ پیشاب ہے) لیکن میں نے معاذاللہ' یہ قیاس نہیں کیا اور نہ ہی تمہارے نانا کے دین کو قیاس سے تبدیل کیا ہے۔ پس امام باقرؒ اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت امام ابو حنیفہ سے معانقہ کیا اور آپ کے چہرے پر بوسہ دیا۔

یاد رکھیے سلف صالحین بالخصوص امام اعظمؒ جیسے جلیل القدر تابعین کا ادب واحترام اور ان

کے علم و فضل کا اعتراف فیض ربانی کے حصول کا یقینی ذریعہ ہے،اور ان سے بغض و عداوت و نفرت اور ان کی شان میں بے ادبی و گستاخی حرمانِ علم و عمل اور عقل و خرد سے محرومی کا سبب ہے۔اس کے ساتھ ساتھ امام اعظمؒ جیسے علم و عمل کے پیکر کی شان میں بے ادبی اور گستاخی خود اس کا ارتکاب کرنے والوں کے گھٹیا پن' ناقص العقل اور بودے ہونے کی اور امام موصوف کی عظمت کی دلیل ہے۔عرب کا منہ زور شاعر متنبّی کہتا ہے اور بجا کہتا ہے'اس کا یہ شعر امام اعظمؒ پر تو سو فیصد صادق آتا ہے :

اذا اتتک مذمتی من ناقص　　　فھی الشھادۃ لی بانی کامل

(جب تیرے پاس کوئی کمتر آدمی میری مذمت کرے'' تو سمجھ لیجیے کہ یہ میرے حق میں اس بات کی شہادت ہے کہ میں کامل ہوں)

آخر میں اس ضمن میں ایک سبق آموز واقعہ بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ یہ واقعہ غیر مقلدین کے جید اور نامور عالم مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کا ہے جو تاریخ اہل حدیث' کے مؤلف بھی ہیں۔وہ خود راوی ہیں :

فیض ربانی ٭ہر چند کہ میں سخت گناہ گار ہوں۔لیکن یہ یقین رکھتا ہوں اور اپنے صالح اساتذہ جناب مولانا ابو عبداللہ عبید اللہ غلام حسن صاحب مرحوم سیالکوٹی اور جناب حافظ عبدالمنان صاحب مرحوم محدث وزیر آبادی کی صحبت و تلقین سے یہ بات یقین کے رتبے تک پہنچ چکی ہے کہ بزرگان دین خصوصاً ائمہ متبوعین سے حسن عقیدت نزول برکات کا ذریعہ ہے۔اس لئے بعض اوقات خدائے تعالیٰ اپنے فضل عمیم سے٭ کوئی فیض اس ذرہ بے مقدار پر نازل کر دیتا ہے۔اس مقام پر اس کی صورت یوں ہے کہ جب میں نے اس مسئلہ کیلئے کتب متعلقہ الماری سے نکالیں اور حضرت امام صاحبؒ(ابو حنیفہؒ) کے متعلق تحقیقات شروع کی تو مختلف کتب کی ورق گردانی سے میرے دل پر (ان کے بارے میں) کچھ غبار آگیا۔جس کا اثر بیرونی طور پر یہ ہوا کہ دن دوپہر کے وقت جب سورج پوری طرح روشن تھا یکایک میرے سامنے گھپ اندھیرا چھا گیا گویا'' ظلمات بعضھا فوق بعض'' کا نظارہ ہو گیا۔معاً خدا تعالیٰ نے میرے دل میں ڈالا کہ حضرت امام صاحبؒ سے بد ظنی کا نتیجہ ہے۔اس سے استغفار کرو۔ میں نے کلماتِ استغفار دہرانے شروع کیے۔ وہ اندھیرے فوراً کافور ہو گئے اور ان کی بجائے ایسا نور چمکا کہ اس نے دوپہر کی روشنی کو مات کر دیا۔اس وقت سے میری امام صاحبؒ سے حسنِ عقیدت اور زیادہ بڑھ گئی اور میں ان شخصوں سے

جن کو حضرت امام ابو حنیفہؒ سے حسن عقیدت نہیں ہے کہا کرتا ہوں کہ میری اور تمہاری مثال اس آیت کی مثال ہے کہ حق تعالیٰ منکرین معارج قدسیہ آنحضرت ﷺ سے خطاب کر کے فرماتا ہے "اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى" میں نے جو کچھ عالمِ بیداری و ہشیاری میں دیکھ لیا ہے اس میں مجھ سے جھگڑا کرنا بے سود ہے۔ ہذا واللہ الہدایہ۔

خاتمہ: اب میں اس مضمون کو ان کلمات پر ختم کرتا ہوں اور اپنے ناظرین سے امید رکھتا ہوں کہ وہ بزرگانِ دین سے خصوصاً ائمہ متبوعین سے حسن ظن رکھیں اور گستاخی اور شوخی اور بے ادبی سے پرہیز کریں۔ کیونکہ اس کا نتیجہ ہر دو جہاں میں موجب خسران و نقصان ہے۔ ولنعم ماقیل :

از خدا خواہیم توفیق ادب بے ادب محروم شد از لطفِ رب

خاکپائے علماء متقدمین و متاخرین
حافظ محمد ابراہیم میر سیالکوٹی (۵۸)

فاعتبروا یا اولی الابصار

المختصر امام نعمان بن ثابت (ابو حنیفہؒ) امتِ مسلمہ کے وہ عظیم فرد ہیں جو بزم فکر و دانش کے گلِ سر سبد اور اس کے صدر نشین تھے۔ بلاشبہ آپؒ امام اعظم اور ربانی فقہ ہیں۔ آپؒ نے اس امت کی ناؤ کو اس وقت سہارا دیا جب وہ ہر طرف سے طغیانیوں کے تھپیڑوں کی زد میں تھی۔ آپؒ نے انتہائی حساس خطوط پر چل کر امت مسلمہ کیلئے لازوال اور عظیم کارنامہ انجام دیا۔

آپ نے اعتدال و انصاف کے معیار پر دلائل و براہین کا فیصلہ کیا اور فہم دین کے سلسلے میں آسانیوں کی سوغات دوشِ اوقات پر رکھ کر ہر عہد کے زندہ شعور مسلمانوں کی طرف روانہ کر دی۔ جس میں اس بات کو واضح طور پر ملحوظ خاطر رکھا کہ قرآن و حدیث اور اقضیہ صحابہؓ پر قیاس کو مقدم نہیں کیا جا سکتا۔

اللہ تعالیٰ امام موصوف کی اس سعی گراں مایہ کو شرفِ قبولیت بخشے جس سے آج تک مسلمان اپنے معاملات کو سنوارنے اور سدھارتے چلے آرہے ہیں اور جس کے پرتو سے دورِ جدید کے پیچیدہ مسائل کی گھتیاں سلجھ رہی ہیں۔ امین یا رب العالمین

حواشی و مصادر

۱۔ الکردری' مناقب الامام الاعظم' ج ۱ ص ۶۵۔۶۶' طبع اول ۱۳۲۱ھ دائرۃ المعارف حیدر آباد

۲۔ المکی' الموفق بن احمد' مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ' ج ۱ ص ۱۶۲' طبع اول ۱۳۲۱ھ دائرۃ المعارف' حیدر آباد

۳۔ المکی' ج ۱ ص ۹۶' ج ۲ ص ۱۳۲۔۱۳۶

۴۔ الیافعی' مرآۃ الجنان وعبرۃ الیقظان' ج ۱ ص ۳۱۰' طبع اول ۱۳۳۷ھ' دائرۃ المعارف' حیدر آباد

۵۔ المکی' ج ۱ ص ۲۲۰

۶۔ الطبری' ج ۶' ص ۲۳۸' ابن کثیر' البدایہ والنہایہ' ج ۱۰ ص ۹۷

۷۔ الخطیب' تاریخ بغداد' ج ۱۳ ص ۳۵۸' ملا علی قاری' ذیل الجواہر المضیئۃ' ص ۴۸۸' دائرۃ المعارف' حیدر آباد' طبع اول ۱۳۳۲ھ

۸۔ المکی' ج ۱ ص ۲۱۹۔۲۲۰

۹۔ الذھبی' مناقب الامام ابی حنیفہ وصاحبیہ' ص ۱۵' دار الکتب العربی' مصر ۱۳۶۶ھ

۱۰۔ الراغب الاصفہانی' محاضرات الادباء ص ۲۰۶' مطبعۃ الہلال' مصر ۱۹۰۲ء

۱۱۔ الذھبی' ص:۲۶

۱۲۔ الذھبی مناقب الامام ابی حنیفہ وصاحبیہ ص ۹

۱۳۔ الخطیب' ج ۱۳ ص ۲۶۰' المکی' ج ۱ ص ۲۶۲

۱۴۔ ابن خلکان' وفیات الاعیان' ج ۵' ص ۲۳۔۲۴ مکتبۃ النہضۃ المصریہ ۱۹۴۸ء / المکی ج ۲' ص ۲۱۲

۱۵۔ المکی' ج ۲' ص ۲۴۶

۱۶۔ المکی' ج ۲' ص ۱۳۳

۱۷۔ الکردری' ج ۲' ص ۱۰۸

۱۸۔ المکی' ج ۲' ص ۴۵

۱۹۔ المکی' ج ۲' ص ۱۳۶

۲۰۔ موجودہ زمانے کے لوگ اس غلط فہمی میں ہیں کہ بین الاقوامی قانون ایک جدید چیز ہے اور پہلا شخص جس نے اس شعبہ قانون کی بنیاد ڈالی ' ہالینڈ کا گروٹیس (Grotius) (۱۵۸۳۔ ۱۶۴۵ء) ہے لیکن جس شخص نے بھی امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام محمد بن حسن الشیبانی

(م ۱۳۲۔۱۸۹ھ / ۷۴۱۔۸۰۵ء) کی کتاب "السیر" دیکھی ہے وہ جانتا ہے کہ گروٹیس سے نوسو برس پہلے یہ علم امام ابو حنیفہؒ کے ہاتھوں بڑی تفصیل کے ساتھ مدون ہو چکا تھا اور اس میں بین الاقوامی قانون کے اکثر گوشوں پر اور اس کے بڑے بڑے نازک مسائل پر بحث کی گئی تھی۔ حال میں اس حقیقت کو اہل علم کے ایک گروہ نے تسلیم بھی کیا ہے اور جرمنی میں "شیبانی سوسائٹی آف انٹر نیشنل لاء" قائم کی گئی ہے۔ (مودودی' ابوالاعلی سید' خلافت وملوکیت' ص ۲۴۱۔۲۴۲' طبع ۲۳' ۱۹۹۴ء ادارہ ترجمان القرآن' لاہور)

۲۱۔ المکی' ج ۲' ص ۱۴۱

۲۲۔ المکی' ج ۲' ص ۱۵۷۔۱۵۸۔ الکردری' ج ۲' ص ۱۰۶۔۱۰۷

۲۳۔ مودودی' ابوالاعلی' سید' خلافت وملوکیت' ص ۲۴۲

۲۴۔ القرآن' ۲/ ۱۸۵

۲۵۔ ایسی مثالیں ہر دور میں رہی ہیں' اور آج بھی ہیں یہ کوئی مفروضہ نہیں ہے۔ بہت سے نو مسلم ایسے ملیں گے جو ایک عرصہ تک قرآن کے عربی تلفظ اور تلاوت پر قادر نہیں ہوتے۔ اگر ان کو نماز میں ترجمہ قرآن پڑھنے کی اجازت نہ دی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اس وقت تک اسلام کا ایک بنیادی رکن ادا کرنے سے محروم رہیں گے جب تک کہ قرآن حکیم کی عربی زبان (اس کے اصل متن) میں تلاوت پر قادر نہ ہو جائیں۔ استاذ محمد ابو زہرہؒ نے اپنی کتاب "ابو حنیفۃ حیاتہ و آراء ہ" میں اس بارے میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔ یہ الگ بحث ہے کہ حنفی فقہاء نے بوجوہ اس رائے کو قبول نہیں کیا۔

۲۶۔ ابن حجر مکی' تبییض الصحیفۃ فی مناقب ابی حنیفۃ' ص ۵۰۴

۲۷۔ المکی' الموفق بن احمد' مناقب الامام الاعظم' ابی حنیفہ

۲۸۔ ابن حجر مکی' تبییض الصحیفۃ فی مناقب ابی حنیفۃ' ص ۵۰۴

۲۹۔ مقدمۃ شرح الزرقانی للموطا

۳۰۔ الهدایۃ' کتاب النکاح' باب فی الاولیاء' والاکفاء۔ ابو زہرۃ ابو حنیفۃ ۳۹۹

۳۱۔ الهدایۃ' کتاب الحجر' باب الحجر للفساد' ابو زہرہ: ابو حنیفۃ ص ۴۰۵

۳۲۔ الهدایۃ' کتاب الحجر' باب الحجر بسبب الدین

۳۳۔ ابو زہرۃ' اصول الفقۃ' طبعۃ دار الفکر العربی' (ت۔ن) ابو حنیفۃ / ۴۱۱

۳۳۔الف الف ملا علی قاری: شرح فقہ اکبر ص ۱۹۹ طبع مجتبائی' دہلی

ب ابن نجیم: البحر الرائق: ج ۵' ص ۱۳۵ طبع دار الکتب العربیہ

۳۴۔ الدبوسی' تاسیس النظر' ص ۱۵۹

۳۵۔ الدبوسی، تاسیس النظر، ص ۱۳

۳۶۔ الشیبانی، محمد بن الحسن، کتاب الاصل، ج ۱ ص ۲۹۸

۳۷۔ حسن الخضاوی، الاستحسان تعریفه وحجیته، ص۶۵۳، بحوث المؤتمر للفقة المالکی، ابوظهبی

۳۸۔ مصطفےٰ الزرقاء ڈاکٹر: المدخل الفقہی العام، ص ۱۳۰، مطبعۃ طربین دمشق، ۱۳۸۷ھ

۳۹۔ وہبۃ الزحیلی ڈاکٹر: نظریة الضرورة الشریعة ص ۲۳۸، دار الفکر دمشق، ۱۴۱۲ھ

۴۰۔ فتاوی عالمگیری، ج ۴، ص ۱۱۲، مطبعۃ السعادة مصر

۴۱۔ المرغینانی، علی بن ابی بکر، برہان الدین (م ۵۹۳ھ): الہدایۃ شرح بدایۃ المبتدی، ج ۳، ص ۵۵، مکتبہ شرکتِ علمیہ ملتان

۴۲۔ حوالہ سابق

۴۳۔ المرغینانی، الہدایہ، ج ۳ ص ۳۰۴

۴۴۔ القرآن، البقرۃ: ۲۹

۴۵۔ القرآن، المؤمن: ۷۹، ۸۰

۴۶۔ مصطفیٰ الزرقاء المدخل الفقہی العام، ص ۱۱۳

۴۷۔ المرغینانی، الہدایہ، ج ۳ ص ۵۵

۴۸۔ تاریخ بغداد، طبع دار الکتب العربی، بیروت، ج ۱۳، ص ۳۶۸

۴۹۔ المکی، موفق بن احمد، مناقب الامام الاعظم، طبع کوئٹہ، ۱۴۰۷ھ، ج ۱، ص ۷۵

۵۰۔ المکی، مناقب الامام الاعظم، ج ۱، ص ۴۴

۵۱۔ المکی، مناقب الامام الاعظم، ج ۱، ص ۷۷۔۷۸

۵۲۔ حوالہ بالا، ص ۸۳

۵۳۔ حوالہ بالا، ص ۹۰

۵۴۔ حوالہ بالا

۵۵۔ بخاری، عبد العزیز امام، کشف الاسرار شرح اصول بزدوی، ج ۲، ص ۳۸۳، طبع کراچی

۵۶۔ الشعرانی، المیزان الکبری، ج ۱، ص ۶۵۰

۵۷۔ المکی، مناقب الامام الاعظم، ج ۱، ص ۸۱

۵۸۔ سیالکوٹی، حافظ محمد ابراہیم میر، تاریخ اہل حدیث، ص ۵۱، ۵۲، مکتبۃ الرحمٰن السلفیہ، سرگودھا۔